فہرست

شذرات	زکوٰۃ پر تملیک کی شرط	منظور الحسن	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۱۸-۲۰)	جاوید احمد غامدی	۷
معارف نبوی	حضرت آدم کا حضرت داؤد کے لیے عمر کا ایثار	طالب محسن	۱۱
دین و دانش	قانون عبادات (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۱۹
حالات و وقائع	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ تنقیدی آرا کا جائزہ	عمار خان ناصر	۲۹
	امام مسلم بن حجاج	محمد رفیع مفتی	۵۹
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۲

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

زکوٰۃ پر تملیک کی شرط

ہمارے فقہا نے مصارف زکوٰۃ پر تملیک ذاتی کی شرط عائد کی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اموال زکوٰۃ کو فرد کی ذاتی ملکیت ہی میں دیا جا سکتا ہے، فلاح عامہ کے کاموں پر براہ راست خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اس رقم سے نہ ہسپتال، مدرسہ یا اس طرح کے اجتماعی ادارے قائم کیے جا سکتے ہیں اور نہ اسے کسی میت کی تجہیز و تکفین یا اس کے قرض کی ادائیگی کے لیے صرف کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی بہبود کے کام میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ کسی فرد کے ہاتھ میں دی جائے اور کفن دفن کے معاملے میں مرنے والے کو موت کی وجہ سے اس سلسلے میں خرچ ہونے والی رقم کا مالک نہیں بنایا جا سکتا۔

تملیک کو زکوٰۃ کی شرط قرار دینے کے لیے بالعموم یہ دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

ایک یہ کہ سورۂ نور کی آیت 'انما الصدقات للفقرا' کے لفظ 'للفقرا' میں حرفِ 'ل' تملیک کے لیے آیا ہے جس کا مفہوم مالک بنانا ہے۔

دوسرے یہ کہ قرآنِ مجید کے الفاظ 'اتوا الزکوۃ' میں لفظِ 'ایتا' تملیک ہی کا مفہوم دیتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نام 'صدقہ' رکھا ہے اور 'تصدق' کا مفہوم تملیک ہی ہے۔

صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے رسالے ''مسئلۂ تملیک'' میں ان دلائل پر تنقید کرتے ہوئے، تملیک ذاتی کے تصور کو قرآن وسنت کے منشا کے خلاف قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا نقطۂ نظر علم و عقل کے لحاظ سے قوی اور قرآن وسنت کے منشا کے مطابق ہے۔ چنانچہ ہم مختصر طور پر اس کا خلاصہ یہاں پیش کر رہے ہیں۔

اولاً، تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے۔

ثانیاً، جہاں تک 'للفقرا' کے 'ل' کا تملیک کے مفہوم میں ہونا ہے تو اس ضمن میں یہ بات واضح رہے کہ عربی زبان

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں 'ل' صرف تملیک کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ متعدد دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان کے معروف عالم ابن ہشام نے اپنی کتاب ''مغنی اللبیب'' میں لکھا ہے کہ یہ 'ل' ۲۲ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے چند استعمالات یہ ہیں:

o استحقاق یعنی مستحق ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ 'الحمد للّٰہ' کے لفظ 'للّٰہ' میں استعمال ہوا ہے۔ اس جملے کا مفہوم ہوگا کہ: ''شکر کا حق دار اللہ ہی ہے۔''

o اختصاص یعنی خاص ہونے کے معنی کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ 'الجنة للمومنین' کے لفظ 'للمومنین' میں آیا ہے۔ اس جملے کا مفہوم ہوگا کہ: ''جنت مومنین کے لیے خاص ہے۔''

o ملکیت یعنی مالک ہونے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ 'له ما فی السموات و ما فی الارض' کے لفظ 'له' میں آیا ہے۔ اس جملے کا مطلب ہوگا کہ: ''اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

o تملیک یعنی مالک بنانے کے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ 'وهبت لزید دینارا' کے لفظ 'لزید' میں آیا ہے۔ اس جملے کے معنی ہوں گے: ''میں نے زید کو ایک دینار ہبہ کر دیا۔''

o عاقبت یعنی انجام کار کے مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسا کہ 'فالتقطه آل فرعون لیکون لهم عدوا و حزنا' کے لفظ 'لیکون' میں آیا ہے۔ اس جملے کا مفہوم ہوگا: ''اور اس (موسیٰ) کو فرعون کے گھر والوں نے دریا سے نکال لیا، تاکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کے لیے دشمن اور غم کا کانٹا بنے۔''

ابن ہشام نے تملیک کے سوا باقی تمام مفاہیم کے لیے مثالیں قرآن مجید سے نقل کی ہیں، لیکن تملیک کے لیے اس نے عربی زبان کا ایک عام جملہ نقل کیا ہے۔ اگر 'انما الصدقات للفقرا' میں 'ل' کا تملیک کے مفہوم میں ہونا اتنا ہی واضح ہوتا تو وہ لازماً قرآن مجید کا یہی جملہ بطور مثال نقل کرتے۔

ثالثاً، 'للفقرا' کے 'ل' کے بارے میں ہمارے آئمہ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ احناف اسے 'عاقبت' کے معنی میں لیتے ہیں۔ مالکیہ 'اجل' کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ امام شافعی تملیک کے مفہوم میں لیتے ہیں۔

رابعاً، اس آیت کا سیاق وسباق تملیک کا مفہوم لینے سے ابا کرتا ہے۔

آیت اور اس کا سیاق وسباق یہ ہے:

''اور ان منافقین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھیں صدقات کی تقسیم کے بارے میں متہم کرتے ہیں، اگر اس میں سے انھیں بھی ان کی خواہش کے بقدر دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو بگڑ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اس پر قناعت کرتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا اور اس کا رسول بھی ہمیں عطا فرمائے گا، ہم تو اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی۔ خیرات کا مال تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو مالِ خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے۔ نیز گردنیں چھڑانے میں اور زیرباروں کے قرضہ میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی ضروریات میں اس کو خرچ کیا جائے۔ یہ اللہ کا ٹھیرایا ہوا فریضہ ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔'' (التوبہ۹: ۵۸۔۶۰)

مولانا امین احسن اصلاحی آیت کے سیاق و سباق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''دیکھیے، یہاں اوپر والی آیت میں ذکر ان منافقین کا تھا جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسنِ ظن اور سوءِ ظن تمام تر اغراض پر مبنی تھا۔ اگر خیرات کے مال میں سے ان کی خواہش کے بقدر انھیں مل جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب تعریفیں کرتے اور خواہش کے بقدر نہ ملتا تو آپ کو متہم کرنے سے بھی باز نہ رہتے۔ آپ پر بے جا جانب داری اور ناروا پاس داری کا الزام لگاتے اور لوگوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتے پھرتے۔ غور کیجیے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات کیا ہوسکتی ہے۔ یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے یا یہ کہ زکوٰۃ وخیرات کی رقوم کے اصل حق دار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات یہ دوسری ہی ہوسکتی ہے نہ کہ پہلی۔ چنانچہ مفسرین میں سے جن لوگوں کی نظر سیاق و سباق پر رہتی ہے، انھوں نے آیت کی یہی تاویل کی بھی ہے۔''

(مسئلۂ تملیک ۱۶)

خامساً، آیت کی اندرونی تالیف تملیک کا مفہوم لینے میں مانع ہے۔ اس کی وضاحت مولانا اصلاحی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''آیت کے اندر، جیسا کہ بالکل واضح ہے، آٹھ اصناف کا بحیثیت مصارف خیر کے ذکر ہے، جن میں سے ابتدائی چار کا ذکر 'لام' کے تحت ہے اور چار کا ذکر 'فی' کے تحت۔ ظاہر ہے کہ کلام میں یہاں کوئی ایسی ہی تقدیر ماننا مناسب ہوگا جو 'لام' کے ساتھ بھی مربوط ہو سکے اور 'فی' کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے۔ اگر 'لام' کو تملیک کے معنی میں لیجیے تو آیت کا ابتدائی حصہ اس کے آخری حصہ سے بالکل ہی بے ربط ہو کے رہ جائے گا۔ کیونکہ 'فی' میں بہرحال تملیکیت کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اگر اس کے اندر پایا جاتا ہے تو افادیت اور خدمت و مصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے 'ما کان العبد فی عون اخیہ' (جب تک کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کے کام میں یا اس کے مصالح کی خدمت میں رہتا ہے)۔ پس آیت کے دونوں حصوں کی ہم آہنگی کا اقتضا یہ ہے کہ یہاں لام کو استحقاق یا انتفاع کے مفہوم میں لیا جائے تاکہ ایک ہی تقدیر کے تحت پوری آیت کی تاویل ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ 'لام' میں تملیک کا مفہوم لیا گیا تو آخری چار اصناف کے ساتھ تملیکیت کا مفہوم جوڑنے کے لیے کلام کی وسعت اور اس کی بلاغت کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا۔'' (مسئلۂ تملیک ۱۷۔۱۸)

دوسری اور تیسری دلیل، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، یہ ہے کہ 'ایتا' اور 'تصدق' کے الفاظ کی حقیقت تملیک ہی ہے۔ ان دلائل کے ضمن میں مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ بعض مقامات پر ان الفاظ میں تملیک کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے، مگر اس میں فیصلہ کن حیثیت سیاق و سباق کو حاصل ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تملیک کا مفہوم ان الفاظ کے اندر ہر

حال میں پایا جاتا ہے۔ اگر حقیقت میں ایسا ہوتا تو ہمیں 'و اتینا ھم الکتاب' (اور ہم نے ان کو کتاب دی)، اور 'اتینا داؤد زبورا' (اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی) میں تملیک کا مفہوم لینا پڑتا جو کہ درست نہ ہوتا۔ اسی طرح سورۂ منافقون کی اس آیت 'فاصدق و اکن من الصٰلحین' (پس میں صدقہ کرتا اور نیکوکاروں میں سے بنتا) سے مراد ہے کہ: ''میں مختلف طریقوں سے اللہ کی راہ میں اور غربا کی بہبود کے کاموں میں فیاضی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا۔'' اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ: ''میں تملیک فقیر کیا کرتا۔'' چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

> '''ایتاء' یا 'تصدق' کے الفاظ تملیک کے معنی یا مفہوم کے لیے ایسے قطعی نہیں ہیں کہ آپ ان کو تملیک کے ثبوت میں نص کی حیثیت سے پیش کریں۔ ان سے اصلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ دینا یا خرچ کرنا ہے۔ یہ دینا اور خرچ کرنا تملیک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ تملیک پر اس قدر اصرار اور وہ بھی تملیک کی ایک خاص نوعیت پر، کہ اس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے، یہاں تک کہ کوئی شخص زکوٰۃ کے پیسوں سے کسی غریب میت کے لیے کفن بھی نہ خرید سکے، کسی غریب مردہ کا قرض بھی ادا نہ کر سکے، میرے نزدیک ایک بالکل بے حقیقت بات ہے۔'' (مسئلۂ تملیک ۲۲)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زکوٰۃ کے لیے تملیک شرطِ لازم نہیں ہے۔ یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی شخص ہی کو اس کا مالک بنایا جائے۔ یہ جس طرح اس کی تحویل میں دی جا سکتی ہے، اسی طرح اس کی بہبود کے کاموں میں بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس مد سے ہسپتال اور اسکول بنائے جا سکتے، شاہراہیں اور مسافر خانے تعمیر ہو سکتے اور لاوارث میتوں کے کفن دفن کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، وَالْمَلٰٓئِكَةُ، وَاُولُوا الْعِلْمِ، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

اللہ نے، اُس کے فرشتوں نے، اور (اِس دنیا میں) علم حقیقی کے سب حاملین نے گواہی دی ہے[۳۱] کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ انصاف پر قائم ہے[۳۲]، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زبردست ہے، بڑی

[۳۱] یعنی اللہ کی وحدانیت اور اُس کا قائم بالقسط ہونا ایک ایسی حقیقت ہے کہ اللہ جو اس عالم کے تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جس کے سامنے تمام موجودات بے حجاب ہیں، جس کی نگاہوں سے زمین و آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، وہ خود بھی اسی کی شہادت دیتا ہے؛ اس کے فرشتے بھی جو اس کی سلطنت کو دیکھتے اور اس میں اس کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، یہی کہتے ہیں؛ اور انسانوں میں سے وہ سب لوگ بھی اسی کی گواہی دیتے ہیں جنھیں حقائق کا علم دیا گیا اور انھوں نے اس علم کو اپنی خواہشات، جذبات اور تعصّبات کی آلایشوں سے پاک رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

[۳۲] اصل میں 'قائماً بالقسط' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'قائماً'، ہمارے نزدیک 'لا الٰہ الا ھو' میں 'ھو' سے حال موکدہ ہے اور اس میں عامل جملے کا مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ یہ اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت، اگر غور کیجیے تو اسلام کے ایمانیات میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جس طرح یہ مانتے

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَاللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ، وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّامِنۡ بَعۡدِمَا جَآءَ ھُمُ الۡعِلۡمُ، بَغۡیًا بَیۡنَھُمۡ، وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ

حکمت والا ہے[۳۳]۔۱۸

(یہ حقیقت ہے تو پھر اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، (اِس لیے کہ وہی اللہ کو اِس طرح ماننے کی دعوت دیتا ہے)، اور جنھیں کتاب دی گئی، اُنھوں نے تو اللہ کی طرف سے اِس حقیقت کا علم اُن کے پاس آ جانے کے بعد محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے اِس میں اختلاف کیا ہے[۳۴]۔ (یہ صریح انکار ہے)، اور جو اللہ کی آیتوں کے اِس طرح منکر ہوں،

ہیں کہ اللہ یکتا اور یگانہ ہے، اس کی ذات وصفات میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور تمام اختیار اور تصرف اصلاً اسی کے ہاتھ میں ہے، اسی طرح یہ بھی مانتے ہیں کہ اپنے اس اختیار و تصرف کو وہ ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اور ہمیشہ انصاف کے ساتھ ہی استعمال کرے گا۔ یہ دنیا چونکہ امتحان کے لیے بنائی گئی ہے، اس لیے اس کے تقاضے سے ظلم و عدوان اور عدم توازن کو اس میں بڑی حد تک گوارا کیا جاتا ہے۔ تاہم اس سے کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے طبعی قوانین جس طرح اٹل ہیں، اس کے اخلاقی قوانین بھی اسی طرح اٹل اور بے لاگ ہیں۔ اس حقیقت پر لوگوں کو متنبہ رکھنے کے لیے، اللہ تعالیٰ اپنی دینونت اس دنیا میں وقتاً فوقتاً برپا کرتا رہتا ہے۔ پہلے یہ رسولوں کے ذریعے سے برپا ہوتی تھی، پھر ذریت ابراہیم کے ذریعے سے برپا ہوئی اور اب گزشتہ کئی صدیوں سے انھی کے ذریعے سے برپا ہے۔ اس کو دیکھ کر کوئی صاحب بصیرت اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ فرداً فرداً تمام انسانوں کے لیے بھی یہ ایک دن اسی طرح برپا ہو جائے گی۔

[۳۳] لہٰذا وہ اپنی دینونت لازماً برپا کرے گا۔ یہ اس کی عزت اور حکمت، دونوں کا تقاضا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو وہ بے بس ہے یا محض ایک کھلنڈرا ہے جس نے یہ دنیا کھیل تماشے کے لیے بنا دی ہے۔

[۳۴] مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا دین بھی یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں پر ابتدا سے یہی دین اتارا۔ اس سے الگ کوئی دین اس نے کسی کو نہیں دیا۔ یہودیت اور نصرانیت کے نام سے جو دین اس وقت موجود ہیں، یہ ان کے ماننے والوں نے اصل دین میں محض ضدم ضدا کی وجہ سے بہت سے اختلاف پیدا کر کے کھڑے کر لیے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com

الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ: اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ، وَمَنِ اتَّبَعَنِ، وَقُلْ

(اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ چنانچہ وہ اگر تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا ہے[۳۵]۔ اور اہل کتاب سے

[۳۵] اصل میں 'اسلمت وجھی للّٰہ ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں چہرہ حوالے کرنا، درحقیقت اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس طرح فرمائی ہے:

''چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ واشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ واشرف حصہ حوالے کر دیا تو گویا سب کچھ حوالے کر دیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے، جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکانا بولتے ہیں۔ اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلاً تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے، لیکن ساتھ ہی اس سے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہوگئی ہے تاکہ دین داری کے ان مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث وجدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں۔'' (۲/ ۵۳)

[۳۶] امی اس شخص کو کہتے ہیں جو مدرسی اور کتابی تعلیم وتعلم سے ناواقف ہو۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیل کے لیے ان کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم وکتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حامل کتاب تھے، امیت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہوسکتا ہے کہ عربوں کے لیے اس کے استعمال کا آغاز اہل کتاب سے ہی ہوا ہو، اس لیے کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی ذریت کی بدویت وامیت کا ذکر تورات میں بھی ہے، لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے محض ممیّز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'نبی امی' کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس میں تورات کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے: 'نحن امۃ امیۃ'۔ بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کا مفہوم محض

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡاُمِّيّٖنَ : ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؟ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِاهۡتَدَوۡا، وَاِنۡ تَوَلَّوۡافَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ ، وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ.﴿۲۰﴾

اور (بنی اسمٰعیل کے) اِن امیوں[۳۶] سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتے ہو؟ پھر اگر کریں تو راستہ پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو تم پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اپنے بندوں کو تو اللہ خود دیکھنے والا ہے[۳۷]۔ ۱۹۔۲۰

لغوی ہے، اصطلاحی نہیں، مثلاً 'منهم اميون لا يعلمون'[oo]۔ اس سے مراد یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۵۳)

[۳۷] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ تمھاری دعوت قبول نہیں کرتے اور اپنی حماقتوں ہی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ و اور مطمئن رہو کہ ان کا فیصلہ اب اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ ان کے ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے، اور ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

o بخاری، رقم ۱۹۱۳۔ مسلم، رقم ۱۰۸۵۔

oo البقرہ ۲: ۷۸۔

طالب محسن

حضرت آدم کا حضرت داؤد کے لیے عمر کا ایثار

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۱۸)

عن ابی هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لما خلق الله آدم مسح ظهره فسقط عن ظهره كل نسمة هو خالقها من ذريته الى يوم القيامة. وجعل بين عينى كل انسان منهم وبيصا من نور . ثم عرضهم على آدم . فقال: أى رب، من هؤلاء؟ قال: ذريتك .فرأى رجلا منهم. فأعجبه وبيص ما بين عينيه. قال: أى رب، من هذا؟ قال: داؤد. فقال؟ أى رب، كم جعلت عمره؟ قال: ستين سنة. قال: رب، زده من عمرى أربعين سنة. قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فلما انقضى عمر آدم إلا أربعين جاء ه ملك الموت. فقال آدم أولم يبق من عمرى أربعون سنة؟ قال: أولم تعطها ابنك داؤد؟ فجحد آدم، فجحدت ذريته. ونسى آدم فأكل من الشجرة فنسيت ذريته. وخطأ آدم وخطأت ذريته.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ چنانچہ وہ تمام جانیں نکل پڑیں جو اللہ تعالیٰ آدم کی ذریت میں سے قیامت تک پیدا کریں گے۔ ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں نور کی لاٹ بنا دی۔ پھر انھیں آدم علیہ السلام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے بتایا: تمھاری ذریت۔ اچانک ان کی نظر ایک آدمی پر پڑی اور اس کی آنکھوں کے بیچ کی لاٹ انھیں بہت پسند آئی۔ انھوں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ فرمایا: داؤد (علیہ السلام)۔ انھوں نے پوچھا: اے رب، اس کی عمر کتنی ٹھیرائی ہے؟ فرمایا: ساٹھ سال۔ عرض کی: اے رب میری عمر میں سے اس کے چالیس سال بڑھا دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا: جب آدم کی عمر چالیس سال نکال کر پوری ہوگئی تو ان کے پاس ملک الموت آیا۔ حضرت آدم نے پوچھا: کیا میری عمر کے چالیس سال ابھی باقی نہیں ہیں۔ فرشتے نے پوچھا: کیا آپ نے یہ چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دے دیے تھے۔ حضرت آدم نے انکار کر دیا۔ اسی طرح اس کی ذریت بھی انکار کرتی رہی ہے۔ آدم بھول گئے اور انھوں نے شجرہ کا پھل کھایا۔ اسی طرح ان کی ذریت بھی بھولتی رہی ہے۔ آدم نے غلطی کی اور ان کی ذریت بھی غلطی کرتی آرہی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

نسمة: یہ لفظ جان کے لیے بھی آتا ہے اور ہر ذی روح کے لیے بھی۔ یہ 'نسم' سے ماخوذ ہے۔ جو روح کی حرکت کے معنی پر متضمن ہے۔ 'نسمة' کا لفظ نرم رو ہوا کے لیے بھی آتا ہے۔

وبیص: روشنی اور چمک اردو کا لفظ لاٹ اس سیاق وسباق میں اس کا صحیح مفہوم واضح کر دیتا ہے۔

متون

اس روایت کے ترمذی میں دو متن نقل ہوئے ہیں۔ ایک متن بہت مفصل ہے۔ دوسرا متن یہی ہے جسے صاحب مشکوٰۃ

نے منتخب کیا ہے۔ اس روایت کا متن خود سنن ترمذی کی مختلف راویتوں میں لفظی فرق سے منقول ہے۔ مثلاً، ترمذی کے میرے سامنے نسخے میں 'عن ظهره' کے بجائے 'من ظهره' روایت ہوا ہے۔ 'قال ذريتك' کی جگہ 'قال هؤلاء ذريتك' آیا ہے۔ دوسری بار 'قال رسول الله صلى الله عليه وسلم' اور 'الا اربعين' کے الفاظ موجود ہی نہیں ہیں۔ اس میں حضرت داؤد کا تعارف مفصل ہے۔ اس متن کے مطابق تعارف کے الفاظ یہ تھے: 'هذا رجل من آخر الامم من ذريتك يقال له داؤد'۔ اس روایت کے کچھ متن مسند احمد میں بھی منقول ہیں۔ ان میں لفظی فرق بھی ہیں اور کچھ ایسی باتیں بھی بیان ہوئی ہیں جو اس متن میں نہیں ہیں۔ ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے عمر دینے کی خواہش کو باقاعدہ معاہدے کی صورت میں لکھ لیا گیا تھا اور اس پر فرشتوں کی گواہی لی گئی تھی۔ ایک روایت میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ حضرت آدم نے جب اس بات سے انکار کر دیا کہ انھوں نے حضرت داؤد کو اپنی عمر کے چالیس سال دے دیے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت داؤد دونوں کی عمر مکمل کر دی یعنی حضرت آدم کے ہزار سال اور حضرت داؤد کے سو سال۔ مسند احمد کی ان روایات میں ذریت آدم کی آنکھوں کی لاٹ کا ذکر نہیں ہے اور حضرت داؤد کے لیے 'يزهر' کا لفظ آیا ہے۔ ایک روایت میں تصریح ہے کہ لین دین پر لکھنے کا دینی حکم حضرت آدم کے اسی انکار کے باعث دیا گیا تھا۔ ترمذی میں منقول اس روایت کا مفصل متن حسب ذیل ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لما خلق الله آدم ونفخ فيه الروح، عطس. فقال: الحمد لله فحمد الله بإذنه. فقال له ربه: يرحمك الله، يا آدم، اذهب إلى اولئك الملائكة إلى ملإ منهم جلوس. فقل: السلام عليكم. قالوا: وعليك السلام ورحمة الله. ثم رجع الى ربه. فقال: إن هذه تحيتك وتحيت بنيك بينهم. فقال الله له ويداه مقبوضتان. اختر ايهما شئت. قال اخترت يمين ربي وكلتايدي ربي يمين مباركة. ثم بسطها	''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان میں روح پھونکی تو انھیں چھینک آئی۔ اس پر انھوں نے (دل میں) کہا کہ وہ الحمد للہ کہیں۔ پھر انھوں نے اللہ کے اذن سے الحمد للہ کہا۔ اس پر ان کے رب نے ان سے کہا کہ اللہ تجھ پر بہت مہربان ہے، اے آدم، ان فرشتوں یعنی ان کے سرداروں کی مجلس میں جاؤ۔ اور انھیں السلام علیکم کہو۔ فرشتوں نے جواب میں وعلیک السلام ورحمۃ اللہ کہا۔ پھر آدم اپنے رب کے پاس آئے تو اللہ نے بتایا یہ تم اور تمھاری اولاد کے لیے باہم ملنے کا طریقہ ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی مٹھیاں بند کر کے ان سے کہا کہ ان میں سے کوئی ہاتھ چن لو۔ آدم نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فإذا فيها آدم وذريته . فقال أى رب ما هؤلاء؟ فقال: هؤلاء ذريتك . فإذا كل إنسان مكتوب عمره بين عينيه، فإذا فيهم رجل أضوؤهم أو من أضوئهم. قال يا رب، من هذا؟ قال: هذا ابنك داؤد قد كتبت له عمر أربعين سنة . قال يا رب زده فى عمره . قال: ذاك الذى كتبت له . قال أى رب، جعلت له من عمرى ستين سنة . قال: أنت وذاك . قال: ثم اسكن الجنة ما شاء الله ثم أهبط منها. فكان آدم يعد لنفسه . قال: فأتاه ملك الموت . فقال له آدم: قد عجلت قد كتب لى ألف سنة . قال: بلى، ولكنك جعلت لابنك داؤد ستين سنة. فجحد فجحدت ذريته . ونسى فنسيت ذريته . قال فمن يومئذ أمر بالكتاب والشهود.
(ترمذی، رقم ۳۲۰۹)

کہا میں نے اپنے رب کا دایاں ہاتھ چن لیا اور میرے رب کے دونوں ہاتھ بابرکت ہیں۔ پھر اللہ نے اس ہاتھ کو کھول دیا تو آدم نے دیکھا کہ اس میں آدم اور اس کی ذریت ہے۔ آدم نے پوچھا: اے رب، یہ کیا ہے؟ اللہ نے بتایا: یہ تمھاری نسل ہے۔ آدم نے دیکھا کہ ہر آدمی کی آنکھوں کے درمیان اس کی عمر لکھی ہوئی ہے۔ آدم نے دیکھا کہ ان میں ایک آدمی سب سے زیادہ روشن صورت ہے۔ آدم نے پوچھا: اے رب، یہ کون ہے۔ بتایا: یہ تمھارا بیٹا داؤد ہے۔ میں نے اس کی عمر چالیس سال لکھی ہے۔ آدم نے کہا: اس کی عمر بڑھا دیجیے۔ اللہ نے کہا: وہی رہے گی جو میں نے لکھ دی۔ آدم نے کہا: اے رب، میں نے اپنی عمر سے ساٹھ سال اس کے لیے ٹھہرا دیے۔ اللہ نے کہا تم جانو اور تمھارا معاملہ۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا انھیں جنت میں رکھا گیا۔ پھر انھیں جنت سے اتار دیا گیا۔ اس سارے عرصے میں آدم اپنی عمر کے سال گنتے رہے۔ ایک دن ملک الموت ان کے پاس آئے۔ آدم نے کہا: آپ جلدی آ گئے ہیں دراں حالیکہ میری عمر ہزار سال ہے۔ ملک الموت نے کہا۔ ٹھیک ہے، لیکن آپ نے ساٹھ سال اپنے بیٹے داؤد کو دے دیے تھے۔ آدم نے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کی اولاد بھی انکار کرتی ہے۔ آدم بھول گیا۔ اب صورت یہ ہے کہ اس کی اولاد بھی بھولتی ہے۔ آپ نے بتایا: اس دن لکھنے اور گواہی لینے کی ہدایت کی گئی۔‘‘

متون کے اس تجزیے سے ایک نتیجہ بالکل واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ اس روایت کو بیان کرنے والے باہم متضاد باتیں روایت کر رہے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معنی

زیر بحث واقعہ صحیح ہے یا نہیں یہ ایک ضروری سوال ہے اوراس پر ہم آخر میں بات کریں گے۔اس سے پہلے ہم اس کہانی کے تین اجزا کے بارے میں کچھ تفصیل بیان کریں گے۔

پہلا جزیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت نکالی تھی۔آدم علیہ السلام کی زندگی کا یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوا ہے۔سورۂ اعراف میں ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ. (۷:۱۷۲)

''اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں، ہم گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں قیامت کے روز کہیں کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن مجید کے اس بیان میں اور روایت کے الفاظ میں ایک فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ آیت میں تمام انسانوں کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کے نکالنے کی بات کہی گئی ہے جبکہ روایت میں یہ بات صرف آدم علیہ السلام ہی سے متعلق ہے۔ اگرچہ روایت اور آیت کے اس فرق کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے،لیکن اس سے بہر حال روایت اور قرآن مجید کے بیان میں رخ کے فرق کا اشارہ ایک اہمیت رکھتا ہے۔

دوسرا جز حضرت آدم کا حضرت داؤد کو ایک نمایاں آدمی کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ انسان ترک واختیار کی آزادی ملنے کے نتیجے میں زمین میں فساد برپا کرے گا اور ایک دوسرے کا خون بہائے گا، اللہ تعالیٰ نے ذریت آدم کو پیش کیا اور آدم علیہ السلام سے کہا کہ وہ اپنی ذریت کے ان لوگوں کے نام انھیں بتائیں جو نیکی اور خیر کے علم بردار ہوں گے اور صالحین کی بڑی بڑی جماعتیں ان کے ساتھ ہوں گی۔فرشتے جونہی اس حقیقت سے آگاہ ہوئے انھوں نے اپنے علم کی کمی کا اعتراف کیا۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی ذریت سے اس طرح متعارف کرایا گیا کہ وہ ان تمام جلیل القدر ہستیوں سے واقف ہو گئے جو ان کی اولاد میں نمایاں ہوں گی۔واقعے کی اس نوعیت میں صرف حضرت داؤد علیہ السلام کا نمایاں نظر آنا محل نظر ہے۔

ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کی تاریخ میں نمایاں ترین مقام رکھتے ہیں۔ یہ وہ پیغمبر ہیں جن کے زمانے میں بنی اسرائیل سیاسی اعتبار سے اوج کمال کو پہنچے۔ان کی قیادت نے بنی اسرائیل کو دنیا کی عظیم ترین قوم بنا دیا اور دنیا کی تمام قوموں پر ان کا تفوق قائم ہو گیا۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے بنی

اسرائیل کے کیا جذبات ہوں گے۔ غالباً یہی جذبات ہیں جو اس روایت کے پیچھے ایک نفسیات کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

قرآن مجید نسل انسانی کے تناظر میں حضرت نوح علیہ السلام، ان کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی نسل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نمایاں شخصیات کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی ساری ذریت سے متعارف کرایا گیا ہوگا تو وہاں بھی صورت معاملہ یہی بیان کی گئی ہوگی۔ یہ روایت اس تاثر کو بالکل بدل دیتی ہے۔

تیسرا حصہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی عمروں سے متعلق ہے۔ روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کی عمر نو سو ساٹھ سال اور حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال ہے اور اگر اس روایت کے دوسرے متون کی تصریح کو مان لیا جائے تو یہ عمریں ہزار اور سو سال ہیں۔ ان دونوں شخصیات کی عمروں کے بارے میں قدیم مذہبی کتب میں بھی تصریحات موجود ہیں۔ بائیبل میں حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کے بارے میں بیان ہوا ہے:

''اور آدم کی عمر کل نو سو تیس برس ہوئی تب وہ مرا۔'' (پیدایش، ۵:۵)

یہودی کی روایات پر مبنی کتاب (The Book of Jubilees) میں ہے:

''جب انیسویں پچاسوی ختم ہو رہی تھی یعنی تیس سال گزر چکے تھے تو آدم فوت ہو گئے۔ ان کے تمام بیٹوں نے انھیں اس سرزمین میں سپرد خاک کیا جہاں ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ اور اس طرح آدم وہ پہلی شخصیت بھی ہوئے جسے سپرد خاک کیا گیا۔ وہ ہزار سال میں سے ستر سال سے محروم رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (صحف) آسمانی کی تصریح کے مطابق ایک ہزار سال ایک دن ہے۔ اور علم کے درخت کے حوالے سے لکھ دیا گیا تھا کہ جس دن تو اس درخت سے کھائے گا اسی دن فوت ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ وہ پہلے دن کے دوران میں فوت ہو گئے۔''

(The Apocrypha and Pseudepigrapha of The Old Testament in English:v.2, p.19,1979 Oxford Press)

یہی بات ہماری کتب[1] تاریخ میں بھی آئی ہے مثلاً طبقات الکبری میں ہے:

فکان عمر آدم تسع مائة سنة و ستا و ثلاثین سنة. (۳۸/۱) ''حضرت آدم علیہ السلام کی عمر نو سو چھتیس سال تھی۔''

ان بیانات کے درج کرنے سے پیش نظر یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ روایات ہزار سال اور نو سو ساٹھ سال کے بیانات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ بہت معمولی عدم مطابقت ہے، اسے نظر انداز کر دینا چاہیے،

---

[1] یہاں یہ بات واضح رہے کہ ہماری یہ کتب زیر بحث روایت بھی نقل کرتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پیش نظر قاری کو تمام قیل و قال فراہم کرنا ہے۔ ہم نے یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیکن روایت ہزار اور نو سو ساٹھ سال کے الفاظ ایک یقین کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس لیے اگر اس روایت کا بیان درست ہو تو یہودی اقوال غلط قرار دیے جانے کے لائق ہیں۔ اسی طرح اگر یہودی روایات ٹھیک ہیں تو پھر اس روایت کی ایک داخلی کمزوری سامنے آتی ہے۔ یہ بات نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کے تعین کے کوئی خارجی ذرائع نہیں ہیں۔ اس لیے بحث کا سارا انحصار مذہبی کتب کے بیان اور ان کے داخلی اشارات کے تجزیوں ہی پر ہے۔

اب حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر کے بارے میں بائیبل کا بیان دیکھیے:

''اور داؤد جب سلطنت کرنے لگا تو تیس برس کا تھا اور اس نے چالیس برس سلطنت کی۔ اس نے حبرون میں سات برس چھ مہینے یہوداہ پر سلطنت کی اور یروشلم میں سب اسرائیل اور یہوداہ پر سینتیس برس سلطنت کی۔'' (۲ سیموئیل ۵: ۴۔ ۵)

اس بیان کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر ستر سال بنتی ہے۔ حضرت داؤد کی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات بائیبل میں موجود ہیں، ان سے قیاس کریں تو اس میں کچھ برسوں کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی اندازے یا اشارے سے یہ عدد سو تک نہیں پہنچتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر کا معاملہ حضرت آدم علیہ السلام سے بالکل مختلف ہے۔ حضرت داؤد کی سلطنت اور ان کے کارہاے نمایاں مفصل روایات کی صورت میں موجود ہیں اور ان کی خارجی ذرائع سے ایک حد تک تصدیق بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بات کافی یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی عمر سو سال نہیں تھی، بلکہ سو سال سے کافی کم تھی۔

اس روایت کا آخری حصہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جب موت کا فرشتہ آیا تو انھوں نے جان دینے سے انکار کر دیا اور جب انھیں یہ کہا گیا کہ آپ اپنی عمر کے چالیس سال داؤد کو دے چکے ہیں تو انھوں نے اس بات کو بھی نہیں مانا اور بعض روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دستاویز اور فرشتوں کی شہادتیں پیش کرنا پڑیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کو اگر درست مان لیں تو اللہ تعالیٰ کے دربار کی عظمت وجلالت اور حضرت آدم علیہ السلام کے کردار کی تصویر بہت دھندلی ہو جاتی ہے۔ یہ روایت اللہ تعالیٰ کو انسانوں ہی کی طرح کا ایک عام بادشاہ بنا دیتی ہے یعنی اسے انسانوں ہی کی طرح اپنی باتیں ثابت کرنی پڑتی ہیں۔ فرشتے خدا کا حکم بھی اس وقت تک نافذ نہیں کر پاتے جب تک یہ بڑے مان نہ لیں، وغیرہ۔

بہرحال، حضرت داؤد کو نمایاں کرنے کی کوشش اس روایت کے ایک اسرائیلی قصہ ہونے کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض صوفیوں کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے محیر العقول واقعات گھڑے گئے ہیں۔ یہ واقعہ بھی اسی انسانی سرشت کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کے تمام واقعات میں ایک چیز بطور علامت موجود ہوتی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ انسانوں کے مقابلے میں کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ صاحب عظمت و کرامت کی برتری اس قیمت پر ثابت کرنے میں بھی یہ قصہ ساز کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی شان مجروح ہو۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

ہم اس روایت کے متون کے واضح اضطراب اور اس کی ان داخلی کمزوریوں کی بنا پر اس روایت کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مزید یہ کہ سند کے اعتبار سے بھی یہ ایک کمزور روایت ہے۔

کتابیات

ترمذی، رقم ۳۰۰۲، ۳۲۰۹۔ مسند احمد، رقم ۲۱۵۷، ۲۵۷۸، ۳۳۳۹، مستدرک، رقم ۳۲۵۷، ۴۱۳۲۔ مسند ابی یعلی، رقم ۶۳۷۷، ۶۶۵۴۔ تاریخ طبری ۱/۴۸۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۰)

نفل نمازیں

نماز کی صورت میں کم سے کم عبادت یہی ہے جس کا مسلمانوں کو مکلّف ٹھیرایا گیا ہے۔ تاہم قرآن کا ارشاد ہے: 'ومن تطوع خيراً، فإن الله شاكر عليم'[۲۸۹] (اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اللہ اسے قبول کرنے والا ہے، اس سے پوری طرح باخبر ہے)۔ اسی طرح فرمایا ہے کہ مصیبت کے موقعوں پر صبر اور نماز سے مدد چاہو، 'استعينوا بالصبر والصلوٰة'[۲۹۰]۔ چنانچہ ان ارشادات کے پیش نظر مسلمان اس لازمی نماز کے علاوہ بالعموم نوافل کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اس طرح کے جو نوافل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھے ہیں یا لوگوں کو ان کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، ان کی تفصیلات یہ ہیں:

نماز سے پہلے

فجر سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم دو ہلکی رکعتیں پڑھ کر نماز کے لیے نکلتے تھے[۲۹۱]۔ سیدہ حفصہ کا بیان ہے کہ آپ یہ رکعتیں فجر کا وقت ہوتے ہی پڑھ لیتے تھے[۲۹۲]۔ سیدہ عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو ان سے زیادہ کسی چیز پر مداومت کرتے نہیں دیکھا[۲۹۳]۔ انھی کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا: فجر کی یہ رکعتیں دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہیں[۲۹۴]۔

۲۸۹۔ البقرہ ۲: ۱۵۸۔

۲۹۰۔ البقرہ ۲: ۴۵۔

۲۹۱۔ بخاری، رقم ۵۹۳، ۵۹۴۔ مسلم، رقم ۷۲۳۔

۲۹۲۔ مسلم، رقم ۷۲۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ظہر سے پہلے آپ کبھی دو اور کبھی چار رکعتیں پڑھتے تھے۔[۲۹۵]

مغرب سے پہلے غالباً آپ نے خود تو کوئی نماز نہیں پڑھی، لیکن لوگوں کو ترغیب دی ہے کہ اللہ توفیق دے تو وہ اس وقت بھی دو رکعت نماز پڑھیں۔[۲۹۶] چنانچہ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ زمانۂ رسالت میں صحابۂ کرام بالعموم اس کا اہتمام کرتے تھے۔[۲۹۷]

نماز کے بعد

ظہر، مغرب اور عشا کے بعد آپ کا معمول تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر گھر آتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔[۲۹۸] جمعہ کی نماز کے بعد بھی آپ کا عام طریقہ یہی تھا۔[۲۹۹] ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ لوگوں کو آپ نے جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنے کے لیے بھی کہا ہے۔[۳۰۰] اسی طرح ظہر کے بعد چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت بھی روایتوں میں بیان ہوئی ہے۔[۳۰۱]

نماز سے پہلے اور بعد کی ان رکعتوں میں سے فجر کی دو، ظہر کی چھ اور مغرب اور عشا کے بعد کی دو رکعتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے ان بارہ رکعتوں کا اہتمام کیا، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔[۳۰۲]

ان کے علاوہ وضو اور اذان کے بعد دو رکعت نماز کی فضیلت بھی آپ سے منقول ہے۔[۳۰۳] سفر سے واپسی پر آپ کے دو رکعت نماز پڑھنے کا ذکر بھی روایتوں میں ہوا ہے۔[۳۰۴] گناہوں سے توبہ اور استخارے کی غرض سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔[۳۰۵] استخارے کی یہ دعا درج ذیل ہے:

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

۲۹۳؎ بخاری، رقم ۱۱۱۶۔ مسلم، رقم ۷۲۴۔

۲۹۴؎ مسلم، رقم ۷۲۵۔

۲۹۵؎ بخاری، رقم ۱۱۱۹۔ مسلم، رقم ۷۲۹، ۷۳۰۔

۲۹۶؎ بخاری، رقم ۱۱۲۸۔ ابوداؤد، رقم ۱۲۸۱۔

۲۹۷؎ بخاری، رقم ۱۱۲۹۔ مسلم، رقم ۸۳۶، ۸۳۷۔

۲۹۸؎ بخاری، رقم ۱۱۱۹۔ مسلم، رقم ۷۳۰۔

۲۹۹؎ بخاری، رقم ۸۹۵۔ مسلم، رقم ۸۸۲۔

۳۰۰؎ مسلم، رقم ۸۸۱۔

۳۰۱؎ ابوداؤد، رقم ۱۲۶۹۔

۳۰۲؎ مسلم، رقم ۷۲۸۔

۳۰۳؎ بخاری، رقم ۱۰۹۸۔ مسلم، رقم ۲۴۵۸۔ احمد، رقم ۸۳۸۴۔

۳۰۴؎ بخاری، رقم ۲۹۲۱، ۲۹۲۲۔ مسلم، رقم ۷۱۶۔

۳۰۵؎ ابوداؤد، رقم ۱۵۲۱۔ بخاری، رقم ۱۱۰۹۔

اللّٰهم إنی أستخيرك بعلمك، وأستقدرك بقدرتك، وأسئلك من فضلك العظيم، فإنك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وأنت علام الغيوب . اللّٰهم إن كنت تعلم أن هذا الأمر خير لی فی دينی ومعاشی وعاقبة أمری، فاقدره لی ويسره لی، ثم بارك لی فيه، وإن كنت تعلم أن هذا الأمر شر لی فی دينی ومعاشی وعاقبة أمری، فاصرفه عنی واصرفنی عنه، واقدر لی الخير، حيث كان، ثم رضنی به۔[306]

''اے اللہ، میں تیرے علم کے واسطے سے تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے واسطے سے قدرت طلب کرتا ہوں، اور تجھ سے تیرے فضل عظیم کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا، اور تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا، اور تو علام الغیوب ہے۔ اے اللہ، اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگانی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر دے اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگانی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے۔ (پروردگار)، میرے لیے خیر کو مقدر فرما، وہ جہاں کہیں بھی ہو، پھر مجھے اس سے راضی کر دے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

چاشت کے وقت

چاشت کے وقت بھی آپ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔[307] ارشاد فرمایا ہے: صبح ہوتے ہی تم میں سے ہر ایک کے جوڑ بند پر صدقہ لازم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آدمی کرنا چاہے تو ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، نیکی کی تلقین صدقہ ہے، برائی سے روکنا صدقہ ہے، اور اگر چاشت کے وقت دو رکعتیں پڑھ لی جائیں تو وہ ان سب چیزوں سے کفایت کر جاتی ہیں۔[308]

تاہم خود آپ نے یہ نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ اس کی روایتیں باہم متضاد ہیں، لہٰذا ان کی بنیاد پر کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

گرہن کے موقع پر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات سورج کو گرہن لگا تو اس موقع پر بھی آپ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اس نماز میں آپ نے بلند آواز سے قرآن پڑھا، بہت لمبے رکوع و سجود کیے اور قیام میں بھی بڑی دیر تک حمد و

---

[306] بخاری، رقم ۱۱۰۹۔

[307] بخاری، رقم ۱۱۷۸۔ مسلم، رقم ۷۲۱۔

[308] مسلم، رقم ۷۲۰۔

ثنا، تسبیح وتحلیل اور دعا ومناجات کرتے رہے، بلکہ گہن چھٹنے کے انتظار میں دونوں رکعتوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ رکوع اور قیام کیا۔ پھر نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: سورج اور چاند اللہ کی دو نشانیاں ہیں۔ یہ کسی کے جینے اور مرنے سے نہیں گہناتے، بلکہ اللہ اس طرح کی چیزوں سے اپنے بندوں کو متنبہ کرتا ہے۔ لہٰذا اسے دیکھو تو اللہ سے دعا کرو، اس کی بڑائی بیان کرو، نماز پڑھو اور اس کی راہ میں صدقہ کرو۔[۳۰۹]

بارش کی دعا کے لیے

بارش کے لیے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو رکعت نماز پڑھانے کا ذکر روایتوں میں ہوا ہے۔ اسے نماز استسقا کہا جاتا ہے۔ روایتوں میں ہے کہ یہ نماز بھی جہری قرأت کے ساتھ پڑھی گئی، اور نماز سے پہلے آپ قبلے کی طرف منہ کر کے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا کرتے رہے۔[۳۱۰] اس موقع پر جو دعائیں آپ نے کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

اللّٰھم اسقنا غیثاً مغیثاً، مرئیاً مریعاً، نافعاً غیر ضار، عاجلاً غیر أجل.[۳۱۱]

''اے اللہ، ہمیں ایسی بارش سے سیراب کر جو ہماری فریاد رسی کرے؛ جس کا انجام اچھا ہو؛ جس سے ارزانی ہو جائے؛ جس سے نفع پہنچے، نقصان نہ پہنچے؛ جلدی آنے والی ہو، دیر نہ کرے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رات کی تنہائی میں

شب و روز کی پانچ نمازوں کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رات میں ایک اور نماز بھی لازم کی گئی تھی۔ اسے بالعموم صلوٰۃ اللیل یا تہجد کی نماز کہا جاتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے 'نافلة لك'[۳۱۲] کے الفاظ سے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ پھر سورۂ مزمل میں مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو انذار عام کا حکم دیا تو اس کے لیے بطور خاص اس نماز کی ہدایت فرمائی۔ قرآن کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ، قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا، نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا، اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ	''اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے، رات کو کھڑے رہو، مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس پر کچھ بڑھا

---

۳۰۹ بخاری، رقم ۹۹۷، ۹۹۹، ۱۰۱۶۔ مسلم، رقم ۹۰۱۔

۳۱۰ بخاری، رقم ۹۷۸، ۹۷۹۔ مسلم، رقم ۸۹۴۔ روایتوں میں اس موقع پر تحویل ردا کا ذکر بھی ہوا ہے اور لوگوں نے بالعموم اسے عبادت کا حصہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس طرح کی کسی چیز کو، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی صراحت کے بغیر یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

۳۱۱ ابوداؤد، رقم ۱۱۶۹۔

۳۱۲ بنی اسرائیل ۱۷: ۷۹۔

تَـرْتِیْلًا، اِنَّـا سَـنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا، اِنَّ نَـاشِئَةَ الَّیْـلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا، اِنَّ لَكَ فِـی النَّھَـارِ سَبْحًا طَوِیْلًا، وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا. (المزمل ۷۳: ۱۔۸)

دو، اور (اپنی اس نماز میں) قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ اس لیے کہ عنقریب ایک بھاری بات کا بوجھ ہم تم پر ڈال دیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رات کا اٹھنا دل کی جمعیت اور بات کی درستی کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس لیے کہ دن میں تو (اس کام کی وجہ سے) تمھیں بہت مصروفیت رہے گی۔ (لہٰذا اس وقت پڑھو) اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو، اور (رات کی اس تنہائی میں) سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو۔‘‘

عام مسلمانوں کے لیے یہ ایک نفل نماز ہے اور جنھیں اللہ تعالیٰ توفیق دے، ان کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اس کا اہتمام کریں۔ بیان کیا گیا ہے کہ آپ اس نماز کی زیادہ سے زیادہ گیارہ رکعتیں پڑھتے اور اس میں بہت لمبا رکوع و سجود اور قیام کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایتوں میں تیرہ رکعتوں کا ذکر بھی ہوا ہے، لیکن اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ نماز چونکہ فرض تھی، اس لیے آپ کبھی کبھی اس سے پہلے یا اس کے بعد اسی طرح دو رکعت نفل نماز پڑھتے تھے، جس طرح ہم، مثلاً فجر سے پہلے یا مغرب کے بعد یہ نفل پڑھتے ہیں، لیکن بعض لوگوں نے غلطی سے اسے اصل کے ساتھ شامل سمجھ لیا۔[۳۱۳] اس باب میں بنیادی حیثیت جس روایت کو حاصل ہے، وہ یہ ہے:

عن أبی سلمة بن عبد الرحمن أنه أخبره أنه سأل عائشة رضی اللّٰه عنها: کیف کانت صلوٰة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی رمضان؟ فقالت: ما کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یزید فی رمضان، ولا فی غیره، علیٰ احدیٰ عشرة رکعة. (بخاری، رقم ۱۱۴۷)

’’عبدالرحمٰن کے بیٹے ابوسلمہ نے بتایا کہ انھوں نے سیدہ عائشہ سے پوچھا: رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیا ہوتی تھی؟ سیدہ نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ رمضان میں کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھتے تھے اور نہ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں۔‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے اس نماز کے جو طریقے ثابت ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ دو دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر ایک رکعت سے یہ نماز وتر کر دی جائے۔[۳۱۴]

۳۱۳؎ بخاری، رقم ۹۴۷، ۱۰۸۷۔ مسلم، رقم ۷۶۳۔

۳۱۴؎ بخاری، رقم ۹۴۶، ۹۵۰۔ مسلم، رقم ۷۳۶، ۷۴۹۔

۲۔ دو دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا جائے، پھر پانچ رکعتیں اس طرح پڑھی جائیں کہ ان میں قعدہ صرف آخری رکعت میں کیا جائے۔[۳۱۵]

۳۔ چار چار رکعتیں عام طریقے سے پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر تین رکعتیں قعدے کے بغیر مسلسل پڑھ کر آخری رکعت میں قعدہ کیا جائے اور اس کے بعد سلام پھیرا جائے۔[۳۱۶]

۴۔ دو یا چار یا چھ یا آٹھ رکعتیں قعدے کے بغیر مسلسل پڑھ کر آخری رکعت میں قعدہ کیا جائے، پھر سلام پھیرے بغیر اٹھ کر ایک رکعت پڑھی جائے اور قعدے کے بعد سلام پھیرا جائے۔[۳۱۷]

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نماز میں پہلے سراً و جہراً، دونوں طریقوں سے قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کے بین بین کا لہجہ اختیار کیا جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ، وَلَا تُخَافِتْ بِهَا، وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰)

''اور اپنی اس رات کی نماز میں نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو، اور نہ بہت پست آواز سے، بلکہ ان دونوں کے بین بین کا لہجہ اختیار کرو۔''

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد اپنے صحابہ کو بھی اسی کا پابند کیا۔ ابوقتادہ کی روایت ہے کہ حضور نے صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تمھارے پاس سے گزرا تو تم (رات کی نماز میں) بہت پست آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: میں اسے سنا تا ہوں جو میری سرگوشی سنتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے کچھ بلند کرلو۔ پھر آپ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تمھارے پاس سے گزرا تو تم بہت بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: میں سوتوں کو جگاتا اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اسے کچھ پست کرلو۔[۳۱۸]

اس نماز کا اصل وقت، جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ مزمل سے واضح ہے، سو کر اٹھنے کے بعد ہی کا ہے اور اسی وجہ سے اسے نماز تہجد کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اسے حضوری کا وقت قرار دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات ہماری اس دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جب ایک تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو فرماتے ہیں: اس وقت کون ہے جو مجھے پکارے کہ میں اس کی پکار کا جواب دوں، کون ہے جو مجھ سے مانگے کہ میں اسے عطا کردوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت

۳۱۵؎ مسلم، رقم ۷۳۷۔ ابوداؤد، رقم ۱۳۵۹۔

۳۱۶؎ بخاری، رقم ۱۰۹۶۔ مسلم، رقم ۷۳۸۔

۳۱۷؎ مسلم، رقم ۷۴۶۔ نسائی، رقم ۱۷۱۰، ۱۷۱۴۔

۳۱۸؎ ابوداؤد، رقم ۱۳۲۹۔ ترمذی، رقم ۴۴۷۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چاہے کہ میں اسے بخش دوں۔[319]

تاہم کوئی شخص اگر یہ سعادت حاصل کرنے میں کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے تو وہ یہ نماز سونے سے پہلے بھی پڑھ سکتا ہے۔سورۂ مزمل میں اس نماز سے متعلق تخفیف کی آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے۔ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ، وَنِصْفَهٗ، وَثُلُثَهٗ، وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ، وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ، عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ، فَتَابَ عَلَيْكُمْ، فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى، وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ، وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ. (۷۳: ۲۰)

’’(ہم نے، اے پیغمبر، تم کو حکم دیا تھا کہ رات میں قیام کرو)۔تمھارا پروردگار بے شک اس بات سے واقف ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب، کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات، اس کے حضور میں کھڑے رہتے ہو، اور تمھارے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ بھی۔ اور اللہ ہی (لوگوں کی ضرورت کے لحاظ سے) رات اور دن کی تقدیر ٹھیراتا ہے۔اس نے جان لیا کہ تم اسے نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر عنایت کی نظر کی۔ چنانچہ اب قرآن میں سے جتنا ممکن ہو، (اس نماز میں) پڑھ لیا کرو۔اس کے علم میں ہے کہ تم میں بیمار بھی ہوں گے، اور وہ بھی جو خدا کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے، اور وہ بھی جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھیں گے۔اس لیے جتنا ممکن ہو، اس میں سے پڑھ لیا کرو۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے:

أيكم خاف أن لا يقوم من اٰخر الليل، فليؤتر ثم ليرقد، ومن وثق بقيام من الليل، فليؤتر من اٰخره، فان قرأة اٰخر الليل محضورة، وذٰلك أفضل. (مسلم، رقم ۱۶۳)

’’تم میں سے جسے اندیشہ ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں نہ اٹھ سکے گا، اسے چاہیے کہ سونے سے پہلے اپنی نماز وتر کر لے، لیکن جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ یقیناً اٹھے گا، اسے یہ نماز رات کے آخری حصے ہی میں پڑھنی چاہیے۔اس لیے کہ آخر شب کی قرأت روبرو ہوتی ہے اور وہی افضل ہے۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نماز ہمیشہ تنہا پڑھتے تھے۔تاہم رمضان کے کسی مہینے میں جب آپ تہجد کے لیے اٹھے اور مسجد میں بوریے کا جو حجرہ آپ رمضان میں بنا لیتے تھے، اس سے نکل کر باہر مسجد میں نماز پڑھی تو آپ کی اقتدا کے شوق میں عام مسلمان

---

۳۱۹ بنی اسرائیل ۱۷: ۷۹۔ بخاری، رقم ۱۰۹۴۔ مسلم، رقم ۷۵۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھی نماز کے لیے جمع ہونے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو چند دنوں کے بعد یہ سلسلہ اس اندیشے سے منقطع کر دیا کہ آپ کی طرح مبادا یہ عام مسلمانوں پر بھی فرض قرار دے دی جائے۔

عروہ بن زبیر کی روایت ہے:

إن عـائشة رضـي اللّٰـه عنها أخبرتـه أن رسـول اللّٰـه صلى اللّٰه عليه وسلم خرج ليـلة مـن جـوف الـليـل، فـصـلـى فـي المسجد، وصلى رجال بصلوٰته، فأصبح الـنـاس فتـحـدثـوا، فـاجتمع أكثر منهم فـصـلـى فـصـلـوا معـه، فـأصبح النـاس فتـحـدثـوا، فكثر أهل المسجد من الليلة الثالثة، فخرج رسول اللّٰه فصلى بصلاته. فـلما كانت الليلة الرابعة، عجز المسجد عـن أهله حتى خرج لصلوٰة الصبح، فلما قضى الفجر، أقبل على الناس فتشهد، ثم قـال: أمـا بـعـد، فـإنـه لم يخف علـى مـكـانـكـم، ولـكـن خشيت أن تفرض عليكم، فتعجزوا عنها. (بخاری، رقم ۲۵۱۲)

''سیدہ عائشہ نے انھیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدھی رات کے وقت نکلے اور آپ نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وہاں کچھ لوگ آپ کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ انھوں نے صبح اس کا ذکر کیا تو دوسرے دن زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ اس رات بھی آپ نے مسجد میں نماز پڑھی تو لوگوں نے آپ کے ساتھ یہ نماز ادا کی۔ صبح پھر اس کا ذکر ہوا تو تیسری رات نمازیوں کی ایک بڑی تعداد مسجد میں آ گئی۔ آپ اس رات پھر نکلے اور لوگوں نے آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ پھر چوتھی رات ہوئی تو مسجد لوگوں سے اس طرح بھر گئی کہ اس میں کسی آنے والے کے لیے جگہ باقی نہ رہی۔ لیکن اس رات آپ صبح سے پہلے نہیں نکلے، بلکہ فجر ہی کے وقت باہر آئے۔ پھر فجر کی نماز کے بعد آپ نے اللہ کے ایک ہونے کی شہادت دی اور فرمایا: میں تم لوگوں کے آنے سے بے خبر نہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ کہیں تم پر فرض نہ کر دی جائے اور پھر تم اسے ادا نہ کر سکو۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک لوگ رمضان کے مہینے میں بھی گھروں اور مسجدوں میں اسے بالعموم اپنے طور پر ہی پڑھتے تھے، یہاں تک کہ وہ ایک دن مسجد کی طرف آئے تو انھوں نے دیکھا کہ لوگ مختلف ٹکڑیوں میں اس طرح یہ نماز پڑھ رہے ہیں کہ کوئی شخص تنہا تلاوت کر رہا ہے اور کچھ کسی امام کی اقتدا میں ہیں۔ اس نماز میں چونکہ تلاوت کچھ بلند آواز سے ہوتی ہے، اس وجہ سے مسجد میں عجیب بے نظمی کی کیفیت تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے آداب کے لحاظ سے اسے پسند نہیں فرمایا اور ابی بن کعب کو اس نماز کے لیے لوگوں کا امام مقرر کر دیا۔ اس کے بعد ایک دوسری رات آپ پھر تشریف لائے، لوگوں

---

۳۲۰ بخاری، رقم ۱۹۰۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کونماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: یہ نئی چیز اچھی ہے، لیکن جس کو چھوڑ کر یہ سوئے رہتے ہیں، وہ اس سے بہتر ہے۔[320]

روایت سے واضح ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف یہ کہ لوگوں کے ساتھ اس نماز میں شامل نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے رات کے آخری حصے میں اٹھ کر تنہا یہ نماز پڑھنے کو اس سے بہتر قرار دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، کبھی گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی۔ تاہم اس کے لیے رکعتوں کی کوئی تعداد چونکہ متعین نہیں ہے، اس لیے جب ایک امام کا تقرر ہوا تو لوگ رمضان میں نماز تراویح کے نام سے اس نماز کی تئیس، بلکہ اس سے بھی زیادہ رکعتیں پڑھنے لگے۔ اس وقت سے اب تک مسلمانوں کا عام طریقہ یہی ہے اور ان میں سے زیادہ اب اس بات سے واقف بھی نہیں رہے کہ یہ درحقیقت تہجد ہی کی نماز ہے جسے وہ عشا کے ساتھ ملا کر پڑھ رہے ہیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ

تنقیدی آرا کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱

مسجد اقصیٰ کی تولیت کے حوالے سے ہماری جو تحریر کچھ عرصہ قبل ان صفحات میں شائع ہوئی تھی[۱]، اس میں چونکہ ایک نہایت حساس اور نازک معاملے پر عام رائے سے بالکل مختلف نقطۂ نظر اختیار کیا گیا تھا، اس لیے اس پر تیز و تند تنقیدوں کا سامنے آنا پوری طرح سے متوقع تھا۔ کسی بھی نقطۂ نظر کی جانچ پرکھ اور اس کی علمی قدر و قیمت کے تعین میں تنقید کا کردار غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ خالصتاً علمی سطح پر مسئلے کی تنقیح کے لیے ایک ایسی سنجیدہ اور مفصل تنقید کی ضرورت ابھی باقی ہے جس میں ہمارے استدلال کے جملہ پہلوؤں کا مربوط انداز میں جائزہ لیا گیا ہو، تاہم اب تک سامنے آنے والی جزوی، غیر مربوط اور زیادہ تر جذباتی تنقیدیں بھی اس حوالے سے یقیناً مفید ہیں کہ انھوں نے ذہنوں میں موجود بہت سے ایسے اشکالات کی ترجمانی کی ہے جن سے تعرض کرنا ہمارے نقطۂ نظر کی توضیح و تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔ چنانچہ تمام ناقدین اس لحاظ سے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس بحث کو آگے بڑھانے اور اس کے تنقیح طلب پہلوؤں پر اپنی معروضات کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کا موقع ہمیں فراہم کیا ہے۔

زیر نظر سطور میں، جو کہ اصل تحریر کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ناقدین کی جانب سے اٹھائے گئے انھی نکات کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ زیر بحث لانا مقصود ہے۔

---

۱ دیکھیے: 'اشراق'، اگست، ستمبر ۲۰۰۳۔

یہود کے حق تولیت کی شرعی حیثیت

زیر بحث مسئلے کا بنیادی سوال، جیسا کہ ہم نے اصل تحریر میں واضح کیا تھا، مسجد اقصیٰ کی تولیت کی شرعی حیثیت کا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی، سید سلیمان ندوی اور مولانا قاری محمد طیب جیسے اکابر اہل علم کی رائے میں بنی اسرائیل کا حق اس عبادت گاہ سے از روے شریعت، اسی طرح منسوخ کر دیا گیا ہے جس طرح کہ مشرکین بنی اسماعیل سے مسجد حرام کی تولیت کا حق چھین لیا گیا تھا۔ یہ رائے، ہمارے علم کی حد تک، برصغیر کے مذکورہ اہل علم سے پہلے امت مسلمہ کی پوری علمی تاریخ میں کسی نے ظاہر نہیں کی، تاہم کوئی نئی بات نہ محض اس وجہ سے رد کی جا سکتی ہے کہ وہ اس سے پہلے کسی کے احاطۂ خیال میں نہیں آئی اور نہ صرف اس وجہ سے اسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ اس کو بعض جلیل القدر اصحاب علم نے پیش کیا ہے۔ علمی آرا کے رد و قبول کے لیے واحد معیار کی حیثیت دلیل کو حاصل ہے اور اس معیار پر کمزور ثابت ہونے والی کسی بھی رائے کو، چاہے وہ قدیم ہو یا جدید، شرف قبولیت نہیں بخشا جا سکتا۔ یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کے حوالے سے مذکورہ رائے، جہاں تک ہم غور و فکر کر سکے ہیں، اسی زمرے میں آتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان اہل علم نے معاملے کے اصل پس منظر کو ملحوظ رکھے اور جملہ علمی پہلوؤں پر مناسب غور و خوض کیے بغیر ایک نتیجہ اخذ کر لیا، ورنہ آل ابراہیم کی تاریخ اور اسلامی شریعت کے واضح احکام و ہدایات، جن میں سے بیشتر کی تشریح و تفصیل خود انھی اہل علم کی تحریروں میں موجود ہے، علمی بنیادوں پر اس تصور کی صاف نفی کرتے ہیں۔ ہم نے اصل تحریر میں اس رائے کے ضعف کے بعض نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن فقہ و شریعت کے مباحث سے مناسب واقفیت نہ رکھنے کے باعث بعض اصحاب قلم ہماری تنقید کو پوری طرح سے سمجھ نہ سکے اور انھوں نے جواب میں اسی استدلال کو دوبارہ پیش کر دیا، چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اس مسئلے کو تمام متعلقہ تفصیلات کی روشنی میں پورے علمی استدلال کے ساتھ واضح کیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

سب سے پہلے تو اس معاملے کے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھیے:

صحف سماوی یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رشد و ہدایت کا سلسلہ تو آغاز ہی سے جاری فرما دیا تھا، البتہ نسل انسانی کے معاشرتی و تمدنی ارتقا کے لحاظ سے اس کے عملی طریقے میں مرحلہ وار تبدیلی کی جاتی رہی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تو اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ بنی آدم مختلف معاشرتی و تمدنی تقاضوں کے تحت قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم ہو کر جہاں جہاں بھی آباد ہیں، وہاں وہاں ان میں انبیا بھیجے جائیں جو انھیں کائنات کے ابدی حقائق سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان میں اپنے رب کے حضور جواب دہی کا احساس پیدا کریں[2]۔ انبیا کی بعثت کا یہ سلسلہ رکے بغیر جاری رہا[3]۔ لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ اسکیم بدل دی گئی اور

۲؎ الفاطر ۳۵: ۲۴

تمام اقوام اور علاقوں میں الگ الگ رسول مبعوث فرمانے کے بجائے نبوت و رسالت کو آل ابراہیم کے لیے خاص فرما کر[4] انھیں پہلے خود دین حق پر عمل پیرا ہونے اور اس کے بعد دنیا کی باقی اقوام تک اس کے ابلاغ و دعوت کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔

آل ابراہیم کے لیے اس ذمہ داری کی ادائیگی کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا گیا:

پہلے مرحلے میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اولاد یعنی بنی اسرائیل کو اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے انھیں فلسطین کا علاقہ بطور وراثت وملکیت عنایت کیا گیا[5]، تورات کی صورت میں احکام وقوانین کا ایک جامع مجموعہ عطا کیا گیا[6]، اس کے بعد ان میں انبیا کا غیر منقطع سلسلہ جاری کیا گیا[7] اور دین و دنیا کی نعمتیں ان پر نچھاور کی گئیں[8]۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اپنے زمانے میں 'ہیکل سلیمانی' کے نام سے ایک نہایت پرشکوہ عبادت گاہ یروشلم میں تعمیر کی اور اسے بنی اسرائیل کا قبلہ اور ان کے مذہبی وروحانی جذبات کا مرکز قرار دیا[9]۔ بنی اسرائیل کا رویہ اس ذمہ داری کے حوالے سے مختلف ادوار میں مختلف رہا۔ بعض ادوار میں وہ اس ذمہ داری کو پوری شان سے ادا کرتے رہے[10] جبکہ اکثر وبیشتر وہ خود دین وشریعت کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے بجائے اس سے منحرف اور گریزاں رہے[11]۔ ایک لمبے عرصے کی آزمایش کے بعد جب بنی اسرائیل مذہبی واخلاقی لحاظ سے اس سطح پر پہنچ گئے کہ من حیث القوم اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوئی توقع ان سے باقی نہ رہی تو ان کے اندر جاری سلسلۂ نبوت کو سیدنا مسیح علیہ السلام کی بعثت پر تمام کرتے ہوئے ملت ابراہیمی کی دعوت کو اقوام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری آل ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی بنی اسمٰعیل کے سپرد کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا[12]۔

بنی اسمٰعیل کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حجاز کے علاقے میں آباد کیا تھا[13] اور انھیں ملت ابراہیمی کی

۳؎ المومنون: ۴۴۔

۴؎ المائدہ: ۲۰۔

۵؎ المائدہ: ۲۱۔

۶؎ الانعام: ۱۵۴۔

۷؎ البقرہ: ۸۷۔

۸؎ البقرہ: ۴۷۔

۹؎ ۱۔سلاطین ۸: ۲۲۔۵۳۔

۱۰؎ المائدہ: ۴۴۔

۱۱؎ المائدہ: ۱۳۔ مریم: ۵۹۔

۱۲؎ الصّف: ۶۔

۱۳؎ ابراہیم: ۳۷۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اعتقادی اساسات کے علاوہ عبادات، سنن اور شعائر پر مبنی عملی تعلیمات کا ایک مجموعہ آغاز ہی سے عنایت کر دیا گیا تھا[14]۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سرزمین عرب میں خداے واحد کی عبادت کے لیے جو سب سے پہلا گھر مکہ مکرمہ میں تعمیر کیا، اس کی تولیت و دربانی کے فرائض بھی آل ابراہیم کی اسی شاخ کے سپرد کیے گئے۔ بنی اسماعیل اپنی تاریخ کے بیشتر حصے میں اصل ملت پر قائم رہے، تاہم رفتہ رفتہ ان میں بھی انحراف پیدا ہوتا گیا اور شرک و بدعت ان کے مابعد الطبیعیاتی تصورات، مناسک عبادات اور معاشرتی رسم و رواج میں سرایت کرتے چلے گئے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ صدیاں بعد بنی اسمٰعیل میں اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ نے ملت ابراہیمی کی اصل تعلیمات کا احیا کرتے ہوئے اس کی طرف انتساب کا دعویٰ کرنے والے دونوں گروہوں یعنی مشرکین بنی اسماعیل اور اہل کتاب کے اختیار کردہ انحرافات کی اصلاح کی اور ان دونوں گروہوں کے اس دعوے کا ابطال کیا کہ وہ ملت ابراہیمی کے حقیقی پیروکار ہیں[15]۔ ان دونوں گروہوں پر اتمام حجت اور جزیرۃ العرب کے بڑے حصے میں دین اسلام کو اپنی حیات ہی میں غالب کر دینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ کے بعد آپ کی نیابت میں اس دین کو اقوام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری صحابہ اور پھر نسلاً بعد نسلٍ امت مسلمہ پر عائد کر دی گئی۔

آل ابراہیم کی ان دونوں شاخوں کے مابین پائی جانے والی ضلالت و انحراف کی یہی مماثلت وہ بنیاد ہے جس پر یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کے قائل اہل علم نے اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

> ''یہ دونوں ہی گروہ خدا کے دین کے دو سب سے بڑے مرکزوں پر قابض تھے اور ان کو انھوں نے، ان کے بنیادی مقصد کے بالکل خلاف، نہ صرف شرک و بت پرستی کا اڈا بلکہ، جیسا کہ سیدنا مسیح نے فرمایا ہے کہ 'تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے'، ان کو انھوں نے چوروں اور خائنوں کا بھٹ ہی بنا ڈالا تھا۔ یہ دونوں ہی مقدس گھر بالکل خائنوں اور بے ایمانوں کے تصرف میں تھے اور یہ ان میں اس طرح اپنی من مانی کر رہے تھے گویا ان گھروں کا اصل مالک کانوں میں تیل ڈال کر اور آنکھوں پر پٹی باندھے سو رہا ہے اور اب کبھی وہ اس کی خبر لینے کے لیے بیدار ہی نہیں ہوگا۔ معراج کا واقعہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے، اس بات کی تمہید تھا کہ اب ان گھروں کی امانت اس کے سپرد ہونے والی ہے جو ان کے اصلی مقصد تعمیر کو پورا کرے گا۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۷۷، ۴۷۸)

قائلین تنسیخ کے استدلال کی تشریح کے بعد اب ہم اس ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید کے صریح نصوص کی روشنی میں اس امر میں بھی کوئی کلام نہیں کہ آل ابراہیم کے یہ دونوں حصے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اصل ملت سے منحرف اور اس کے مقاصد و مطلوبات کو پورا کرنے میں ناکام ہوئے، اور یہ بات بھی شک و شبہ سے

---

۱۴ الحج: ۲۶ تا ۳۸۔ ۷۸۔

۱۵ آل عمران: ۶۷، ۶۸۔

بالاتر ہے کہ اس انحراف کی پاداش میں بنی اسماعیل کے مشرکین کو بیت الحرام جبکہ بنی اسرائیل کو مسجد اقصیٰ کے حق تولیت سے محروم کیا گیا، البتہ ان دونوں گروہوں کے حق تولیت سے محروم کیے جانے کی نوعیت میں، ہمارے نزدیک، ایک بنیادی فرق ہے، اور وہ یہ کہ مشرکین بنی اسماعیل کا حق تولیت تو ازروے شریعت ابدی طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دوبارہ بیت اللہ پر متصرف ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل کو شرعی طور پر نہیں، بلکہ محض تکوینی طور پر مسجد اقصیٰ کی تولیت سے محروم کیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس عبادت گاہ کے دوبارہ ان کے زیر تصرف آنے میں اسلامی شریعت کا کوئی حکم مانع نہیں اور اللہ تعالیٰ جب چاہیں، ایسے حالات واسباب پیدا فرما سکتے ہیں کہ یہ امکان حقیقت کا روپ دھار لے۔

دونوں عبادت گاہوں کے مابین اس فرق کی دلیل، ہمارے نزدیک یہ ہے کہ قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت اور آپ کی جدوجہد کے اہداف میں ان دونوں عبادت گاہوں کے حوالے سے ایک بالکل واضح امتیاز قائم کر دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی روشنی میں عملی لحاظ سے جو رویہ اختیار فرمایا، وہ ان دونوں عبادت گاہوں کے حوالے سے قطعی مختلف اور متباین ہے۔

پہلے مسجد حرام کے معاملے کو دیکھیے:

قرآن مجید نے یہ بات نہایت اہتمام کے ساتھ ایک مسلسل مضمون کے طور پر بیان کی ہے کہ مسجد حرام کو مشرکین کے قبضے سے چھڑانا اور اس کو شرک و بدعت کے آثار سے بالکل پاک کر کے اصل حیثیت میں دوبارہ توحید کی دعوت کا عالمی مرکز بنا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا سب سے بڑا ہدف ہے۔ چنانچہ مشرکین پر اتمام حجت کے مرحلہ میں مسلمانوں پر یہ بات پورے تسلسل کے ساتھ واضح کی جاتی رہی کہ مسجد حرام پر مشرکین کا کوئی حق نہیں، اس کے اصل حق دار اہل ایمان ہیں اور اگر مشرکین انھیں اس مسجد میں آنے اور وہاں عبادت کرنے سے روکیں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس حق کے حصول کے لیے مشرکین کے ساتھ قتال کریں۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں مرحلہ وار نازل ہونے والی تاکیدات حسب ذیل ہیں:

o ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ قتال کی اجازت سب سے پہلے جس آیت میں دی گئی، وہ بیت اللہ پر مشرکین کے قبضہ اور ان کے طرز عمل کے تناظر میں وارد ہوئی ہے۔ سورۂ حج میں اس سلسلۂ بیان کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ.	''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور اس حرمت والی مسجد سے بھی جسے ہم نے تمام لوگوں کے لیے مساوی کر دیا ہے، وہیں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں، جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں الحاد کا ارادہ کرے، ہم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔‘‘ (الحج ۲۲: ۲۵)

اس کے بعد مشرکین کے الحاد اور کفر کو واضح کرنے کے لیے آیت ۲۶ سے ۳۸ تک بیت اللہ کی ابتدائی تاریخ اور اس کی تعمیر کے اصل مقصد کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کے لیے جگہ خود متعین فرما کر حضرت ابراہیم کو اس کی تعمیر کا حکم دیا اور انھیں اس کا متولی بنا کر ہدایت کی کہ وہ اس کو خداے واحد کی عبادت کرنے والوں کے لیے کفر و شرک کی آلودگیوں سے پاک رکھیں۔ اسی ضمن میں قربانی کی رسم کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت ابراہیمی میں قربانی صرف اللہ کے نام پر مشروع کی گئی تھی اور اس کے پیروکاروں سے کہا گیا تھا کہ وہ خداے واحد ہی کے حضور قربانی گزرانیں اور اصنام و اوثان کی نجاست سے دور رہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ چونکہ مشرکین نے ملت ابراہیمی کے اصل پیروکاروں یعنی اہل ایمان کو محض اس وجہ سے مکہ مکرمہ سے نکال دیا ہے کہ وہ توحید کے قائل ہیں، اس لیے انھیں اجازت ہے کہ اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے مشرکین سے جہاد کریں:

أُذِنَ لِـلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللّٰهَ عَـلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ. الَّـذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (الحج ۲۲: ۳۹-۴۰)

’’جن مسلمانوں سے کافر جنگ کر رہے ہیں، انھیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ ہیں جنھیں ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا، صرف یہ کہنے پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

o ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے موقع پر سورۂ انفال میں جو ہدایات نازل کی گئیں، ان میں مسلمانوں کو اس حقیقت کی دوبارہ یاددہانی کرائی گئی۔ فرمایا گیا کہ جب تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں ان مشرکین کے مابین مقیم تھے، اس وقت تک اللہ کے ضابطے کی رو سے ان پر عذاب نہیں آ سکتا تھا، لیکن آپ کی ہجرت کے بعد اس عذاب کے نازل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی:

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْا أَوْلِيَآءَهُ إِنْ أَوْلِيَآؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الانفال ۸: ۳۴)

’’اور ان میں کیا بات ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ سزا نہ دے حالانکہ یہ مسجد حرام سے روکتے ہیں جبکہ وہ اس کے متولی نہیں۔ اس کی تولیت کے حق دار تو صرف اہل تقویٰ ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔‘‘

اس کے بعد چند آیات میں مشرکین کے طرز عمل کی قباحت و شناعت کو بیان کیا گیا ہے اور پھر اہل ایمان کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ

’’اور تم ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین

الدِّيۡنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ. (الانفال ۸:۳۹)

اللہ ہی کا ہو جائے۔ پھر اگر یہ باز آ جائیں تو اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔''

o ۶ ہجری میں معاہدۂ حدیبیہ کے قریبی زمانے میں حج اور عمرے کی رسوم کے حوالے سے بعض اہم احکام قرآن مجید میں نازل ہوئے جن کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات ۱۸۹ تا ۲۰۳ میں ہے۔ اس سلسلۂ بیان کا آغاز اس آیت سے ہوا ہے:

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَهِلَّةِ قُلۡ هِيَ مَوَاقِيۡتُ لِلنَّاسِ وَالۡحَجِّ. (البقرہ ۲:۱۸۹)

''وہ تم سے محترم مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔''

بیت اللہ پر اس وقت مشرکین قابض تھے، اور اس بات کا پورا امکان موجود تھا کہ وہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکیں گے۔ چونکہ اس صورت حال میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم پہلے سے دیا جا چکا تھا، اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ حرمت والے مہینوں میں تو قتال مشروع نہیں، پھر مشرکین سے جہاد کیسے کیا جائے؟ چنانچہ حج کے متعلق ہدایات کے اصل سلسلے کو روک کر قرآن مجید نے یہاں اس سوال سے تعرض کیا اور فرمایا کہ اگر مشرکین مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنے کی کوشش کریں تو ان کے ساتھ قتال لازماً کیا جائے۔ حرام مہینوں میں قتال سے متعلق اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ وَاَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ اَخۡرَجُوۡكُمۡ وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ وَلَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوۡكُمۡ فِيۡهِ فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ. فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ. (بقرہ ۲:۱۹۱-۱۹۲)

''اور انھیں جہاں بھی پاؤ، مار ڈالو اور جیسے انھوں نے تمھیں نکالا ہے، تم بھی انھیں نکال دو۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک کہ یہ خود تم سے نہ لڑیں۔ پھر اگر یہ تم سے لڑیں تو تو ان کو مار ڈالو۔ ان کافروں کا بدلہ یہی ہے۔ ہاں اگر باز آ جائیں تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس سورہ میں قبلہ کی بحث سے لے کر یہاں تک کے مباحث پر اگر آپ کی نظر ہے تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ ساری بحث عام کفار سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس کا خاص تعلق کفار قریش سے ہے۔ ان کی اور مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملے کے لیے محض ایک وقتی نزاع نہیں تھی، بلکہ اصلاً یہ نزاع بیت اللہ کی تولیت کے لیے تھی۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے گھر کی تولیت کے اصلی حق دار اہل ایمان ہیں نہ کہ کفار و مشرکین جنھوں نے اس گھر کو اس کے بنیادی مقاصد کے بالکل برخلاف شرک و کفر کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم کی دعا اور وعدۂ الٰہی کے بموجب جس آخری نبی کے ذریعہ سے اس گھر کے مقاصد کی تجدید و تکمیل ہونی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی نے اس وعدے کی تکمیل کر دی اور اب یہ لازمی ہے کہ یہ گھر کفار و مشرکین کے تسلط سے آزاد اور کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو کر ملت ابراہیم ـــــ اسلام ـــــ کا مرکز اور تمام اہل ایمان کا قبلہ بنے۔ یہ دعویٰ جن دلائل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وبراہین اور جس زور وقوت کے ساتھ اس پوری سورہ میں پیش ہوا ہے، اس میں کہیں کسی لچک اور کسی نرمی کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے، بلکہ واضح الفاظ میں بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو شرک وکفر کی تمام آلایشوں سے پاک کر کے از سر نو اس کو توحید واسلام اور ملت مسلمہ کا مرکز بنانا رسالت محمدی کا اصلی نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس مشن کا آخری کام تھا۔‘‘ (ایضاً، ۴۷۶)

احکام شریعت کے اسی سلسلۂ بیان میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں پر قتال کی فرضیت کے حکم کا اعادہ کیا ہے اور مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ وہ اس باب میں کسی قسم کی مداہنت کا شکار نہ ہوں:

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰٓ أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰٓ أَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (۲:۲۱۶)

’’تم پر قتال فرض کیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بہتر نہ ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

o بیت اللہ پر قابض مشرکین کے خلاف جہاد وقتال کی ان مسلسل تاکیدات کے بعد جب ۶ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ عمرے کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو مشرکین نے انھیں حدیبیہ کے مقام پر روک دیا۔ سابقہ ہدایات کی رو سے اس موقع پر جہاد مسلمانوں پر لازم تھا، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اہم تر مصالح کے پیش نظر مشرکین سے صلح کا معاہدہ کر لیا تو اس کو ذہنی طور پر قبول کرنا صحابہ کے لیے ایک آزمایش بن گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس صلح کی حکمت اور اس کے پوشیدہ فوائد پر باقاعدہ ایک سورت نازل فرمائی جس میں انھیں یہ بتایا گیا کہ اگرچہ مشرکین ان کو مسجد حرام سے روکنے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن چونکہ مکہ میں ابھی بہت سے ایسے اہل ایمان موجود ہیں جو اپنے ایمان کو مخفی رکھے ہوئے ہیں اور ان کے اور مشرکین کے مابین واضح امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے خدشہ ہے کہ وہ بھی لڑائی میں تہ تیغ ہو جائیں گے، اس لیے اس موقع پر قتال کو موخر کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں فتح مکہ کی بشارت اس وضاحت کے ساتھ دی گئی کہ مسجد حرام کا مسلمانوں کے تصرف میں آنا چونکہ ’اظہار دین‘ کا لازمی تقاضا ہے، اس لیے یہ وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا. هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ

’’یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا کہ اللہ نے چاہا تو تم یقیناً پورے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے، سر منڈواتے ہوئے اور سر کے بال کترواتے ہوئے، تمھیں کوئی خوف لاحق نہیں ہوگا۔ وہ ان باتوں کو جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے، پس اس نے اس کے بعد

رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا. (الفتح ۴۸: ۲۷۔ ۲۸)

ایک قریبی فتح تمھارے لیے مقدر کر دی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔ اور اللہ کافی ہے گواہی دینے والا۔''

o یہ بشارت معاہدۂ حدیبیہ کے دو ہی سال بعد ظہور پزیر ہوگئی۔ چنانچہ مشرکین کی طرف سے نقض عہد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مشن کی تکمیل کے لیے دس ہزار صحابہ کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے اور مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر آپ نے بیت اللہ کو تمام اصنام واوثان اور مشرکانہ رسوم کے تمام آثار سے پاک کر کے اس کو دین ابراہیمی کی اصل اساس یعنی توحید کا عالمی مرکز ہونے کی حیثیت سے بحال کر دیا۔[16] تاہم بیت اللہ کے ظاہری انتظام وانصرام کو آپ نے سردست سابقہ طریقے پر قائم رہنے دیا[17] اور مشرکین کو بھی فی الحال بیت اللہ میں آنے اور اس میں عبادت کرنے کی اجازت دی گئی۔[18]

o اس مشن کے آخری مرحلہ کے طور پر ۹ ہجری میں قرآن مجید کی سورہ براءۃ میں یہ اعلان کیا گیا کہ چونکہ مشرکین پر اتمام حجت کا مرحلہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، اس لیے اب ان کو جان کی امان حاصل نہیں رہی۔ انھیں یا تو اسلام قبول کرنا ہوگا اور یا مرنے کے لیے تیار ہونا ہوگا۔[19] اسی حکم کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ ۹ ہجری کے بعد مشرکین بیت اللہ کی تولیت اور اس میں عبادت تو کجا، اس کے قریب آنے کے حق دار بھی نہیں ہیں۔[20] اس سال حج کے موقع پر اس حکم کی باقاعدہ منادی کی گئی۔[21] ۱۰ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکہ مکرمہ میں تشریف لائے اور دین ابراہیمی کی روایات کے مطابق مناسک حج کی تعلیم لوگوں کو دی۔[22] اس کے ساتھ ہی کفر وشرک سے بیت اللہ کی تطہیر اور اس کو توحید کا عالمی مرکز بنانے کا مشن مکمل ہو گیا، چنانچہ آپ نے اس موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ:

ان الشیطان قد ایس من ان یعبد فی بلادکم هذه ابدا. (ترمذی، الفتن، ۳۰۸۵)

''شیطان کو اب اس بات کی کوئی امید نہیں رہی کہ جزیرۃ العرب میں دوبارہ کبھی اس کی پوجا کی جائے گی۔''

---

۱۶ مسلم، الجہاد والسیر، رقم ۳۳۳۱۔

۱۷ ابن ماجہ، الدیات، ۲۶۱۸۔

۱۸ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۴/ ۷۰۔

۱۹ براءۃ: ۵۔

۲۰ براءۃ: ۱۷، ۲۸۔

۲۱ بخاری، تفسیر القرآن، ۴۲۹۰۔

۲۲ مسلم، الحج، ۲۲۸۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اب اس کے مقابلے میں اس رویے کو ملاحظہ فرمائیے جو مسجد اقصیٰ کے حوالے سے اختیار کیا گیا:

ا۔ مکی عہد نبوت میں سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اسرا کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کرایا گیا۔ اس سلسلۂ بیان میں اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کی تباہی و بربادی اور اس سے یہود کی بے دخلی کے دو معروف واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے بنی اسرائیل کو یاد دلایا ہے کہ یہ ان کی سرکشی اور فساد کے نتیجے میں رونما ہوئے تھے۔ مسجد اقصیٰ کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت وہ یہود کے زیر تصرف نہیں تھی، بلکہ تباہ شدہ کھنڈرات (Ruins) کی صورت میں ویران پڑی تھی۔ یہ بات بھی، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ مستقبل قریب میں اس عبادت گاہ کو آباد کرنے کا شرف عملاً مسلمانوں کو حاصل ہونے والا ہے۔ اگر یہود کے حق تولیت کی شرعی بنیادوں پر قطعی تنسیخ مقصود ہوتی تو یہاں یہود سے صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ فساد اور سرکشی کے نتیجے میں اس مسجد سے بے دخلی کے بعد اب تمھارے اس پر دوبارہ متصرف ہونے کا کوئی امکان نہیں اور اس عبادت گاہ کی آبادی اور تولیت کا حق اب تمھارے بجائے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے گا، لیکن اس کے برعکس قرآن مجید صاف لفظوں میں یہ فرماتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے پہلے کی طرح اب بھی اس مسجد کے دوبارہ بنی اسرائیل کے تصرف میں آنے کا امکان موجود ہے:

عَسَي رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۸)

''توقع ہے کہ تمھارا رب تم پر پھر رحمت کرے گا۔ اور اگر تم نے دوبارہ یہی روش اختیار کی تو ہم بھی تمھارے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔''

امام بقاعی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ولما انقضى ذلك كان كانه قيل: اما لهذه المرة من كرة كالاولى؟ فاطمعهم بقوله سبحانه وتعالىٰ: (عسى ربكم) اى الذى عودكم باحسانه (ان يرحمكم) فيتوب عليكم ويكرمكم ثم افزعهم بقوله تعالىٰ: (وان عدتم) ان بما نعلم من دبركم الى المعصية مرة ثالثة فما فوقها (عدنا) اى بما تعلمون لنا من العظمة الى عذابكم فى الدنيا.

(البقاعی، نظم الدرر ۴/ ۳۶۳)

''جب یہ بات مکمل ہو گئی تو اب گویا یہ سوال سامنے آیا کہ کیا پہلے کی طرح بنی اسرائیل پر دوبارہ اللہ کی رحمت کے متوجہ ہونے کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ توقع دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ، جو پہلے بھی ان پر انعام و احسان کرتا رہا ہے، اب بھی تم پر رحم کر سکتا اور تم پر نظر عنایت کر کے تمھاری عزت افزائی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ کر ان کو متنبہ بھی کر دیا گیا کہ اگر تم نے تیسری یا چوتھی مرتبہ پھر نافرمانی کی طرف پلٹ جانے کا وتیرہ اختیار کیا تو ہم بھی اپنی اس عظمت و قدرت کے ساتھ جسے تم خوب جانتے ہو، دنیا ہی میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تمھیں دوبارہ عذاب کا نشانہ بنا دیں گے۔''

امام صاحب نے اس کے بعد اس وعدے کی تفسیر میں تورات کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے:

''اور جب یہ ساری باتیں یعنی برکت اور لعنت جن کو میں نے آج تیرے آگے رکھا ہے، تجھ پر آئیں اور تو ان قوموں کے بیچ جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھ کو ہنکا کر پہنچا دیا ہو، ان کو یاد کرے اور تو اور تیری اولاد دونوں خداوند اپنے خدا کی طرف پھریں اور اس کی بات ان سب احکام کے مطابق جو میں آج تجھ کو دیتا ہوں، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے مانیں تو خداوند تیرا خدا تیری اسیری کو پلٹ کر تجھ پر رحم کرے گا اور پھر کر تجھ کو سب قوموں میں سے جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھ کو پراگندہ کیا ہو، جمع کرے گا۔ اگر تیرے آوارہ گرد دنیا کے انتہائی حصوں میں بھی ہوں تو وہاں سے بھی خداوند تیرا خدا تجھ کو جمع کر کے لے آئے گا اور خداوند تیرا خدا اسی ملک میں تجھ کو لائے گا جس پر تیرے باپ دادا نے قبضہ کیا تھا اور تو اس کو اپنے قبضہ میں لائے گا۔'' (استثنا ۳۰: ۱۔۵)

اس سے واضح ہے کہ ۷۰ء میں بنی اسرائیل کو تکوینی طور پر اس مسجد کی تولیت سے محروم کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا تھا، اس کو تشریعی حکم میں تبدیل کر کے یہود کے اس حق کو قطعی اور حتمی طور پر منسوخ کر دینا اللہ تعالیٰ کے پیش نظر نہیں ہے۔

بعض اہل علم کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہود کے حق میں اس وعدے کا پورا ہونا آپ پر ایمان لانے کے ساتھ مشروط ہو گیا تھا اور چونکہ آپ کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے، اس لیے اس وعدے کے پورا ہونے کا امکان اب ان کے حق میں باقی نہیں رہا،[۲۳] دو وجوہ سے بالکل بے معنی ہے:

ایک تو یہ کہ جب اسلامی شریعت میں یہود کو ایک مذہبی گروہ کے طور پر باقی رہنے اور اپنے مذہب پر پوری آزادی کے ساتھ عمل کرنے کا حق دیا گیا اور ان کے مذہبی مقامات وشعائر کے احترام کی تلقین کی گئی ہے تو ان کو اپنے قبلے سے محروم کرنے کی کیا تک ہے؟ کسی مذہبی گروہ سے یہ کہنا کہ تمھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کا تو پورا پورا حق ہے اور ہماری طرف سے تمھارے مذہبی شعائر ومقامات کو بھی پوری طرح تحفظ حاصل ہوگا، لیکن اگر تم اپنے قبلے کے ساتھ کوئی تعلق باقی رکھنا اور اس میں عبادت کا حق حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے تمھیں اپنے مذہب سے دست برداری اختیار کر کے ہمارے مذہب میں آنا ہوگا، آخر ایک مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت، بدیہی طور پر، صرف جزیرۂ عرب کے یہود پر ہوا تھا نہ کہ پوری دنیا کے یہودیوں پر۔ جزیرۂ عرب کے یہود دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے بنی اسرائیل کا صرف ایک حصہ تھے۔ اب یہ بات کیسے معقول اور مبنی بر انصاف ہو سکتی ہے کہ جزیرۂ عرب کے یہود پر اتمام حجت کی بنیاد پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے ان سارے یہودیوں پر بھی تنسیخ تولیت کا فیصلہ صادر کر دیا جائے جن پر اتمام حجت تو

۲۳؎ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی ۳/ ۲۵۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

درکنار، ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر بھی نہیں پہنچی تھی؟

۲۔ مسجد اقصیٰ کا ذکر دوسری مرتبہ ہجرت مدینہ کے بعد تحویل قبلہ کے تناظر میں سورۂ بقرہ میں ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ کے نظم کی روشنی میں دیکھیے تو اللہ تعالیٰ نے یہاں حق تولیت کے حوالے سے مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے فرق کو بہت نمایاں طریقے سے واضح فرمایا ہے۔ سورۂ بقرہ کے پہلے تہائی حصے میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعض اہم واقعات کے تذکرہ کے بعد سورہ کے باقی حصے میں ملت ابراہیمی میں مسجد حرام کی حیثیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ساتھ اس کے تعلق کو ایک مربوط طریقے سے واضح کیا گیا ہے، چنانچہ بیت اللہ کی ابتدائی تاریخ کے ساتھ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سیدنا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی دعا کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اصل مشن کو واضح کرتا ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اسی ضمن میں تحویل قبلہ کا واقعہ بیان کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ملت ابراہیمی کے اصل مرکز اور مرجع کی حیثیت مسجد حرام کو حاصل ہے نہ کہ مسجد اقصیٰ کو۔ آگے چل کر شرعی احکام وہدایات کے سلسلۂ بیان میں مشرکین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے جو اس مرکز توحید کو کفر وشرک کا گڑھ بنائے ہوئے تھے اور اہل توحید کو اس میں داخل ہونے سے روکتے تھے۔ احکام وہدایات کے اس سلسلے کے مکمل ہونے کے بعد مسلمانوں میں فتح مکہ کے لیے جہاد کا جذبہ بیدار کرنے کی غرض سے بنی اسرائیل کی تاریخ سے ایک گہری مماثلت رکھنے والا واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس میں انھوں نے طالوت اور سیدنا داؤد کی قیادت میں فلسطین کو فتح کیا۔ اس کے بعد سورہ کے آخر تک اس جہاد ہی کے تعلق سے انفاق فی سبیل اللہ کے احکام اور اس کے آداب وشرائط کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا بیت اللہ کی ابتدائی تاریخ سے لے کر سورہ کے آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابراہیمی مشن اور اس میں مسجد حرام کی اہمیت ایک مسلسل اور مربوط مضمون کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھ لیجیے، حق تولیت کے حوالے سے صرف مسجد حرام زیر بحث آئی ہے اور اسی کے لیے جہاد وقتال کی ترغیب دی گئی ہے۔ مسجد اقصیٰ کا ذکر ہوا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے تعلق سے اس کی اہمیت بیان کرنے کے لیے نہیں بلکہ، اس کے برخلاف، یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس کو ملت ابراہیمی کے اصل مرکز کی حیثیت حاصل نہیں۔ اس کو عارضی طور پر قبلہ مقرر کرنا محض بعض وقتی مصالح کے تحت تھا، ورنہ مسلمانوں کے لیے قبلے اور مرکز کی حیثیت اول وآخر مسجد حرام کو حاصل ہے اور اسی کو مشرکین کے قبضے سے چھڑا کر توحید کا عالمی مرکز بنا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا سب سے بڑا ہدف ہے۔

علاوہ ازیں مسجد اقصیٰ کا ذکر کرتے ہوئے 'قبلتھم' کے الفاظ سے جس طرح اس کے ساتھ یہود کے قلبی تعلق اور وابستگی کو ایک مثبت جذبے کے طور پر نمایاں کیا گیا ہے، وہ بذات خود تنسیخ تولیت کے تصور کے خلاف ایک لطیف اشارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ اس باب کا سب سے اہم اور صریح بیان جو حق تولیت کے حوالے سے ان دونوں عبادت گاہوں کے فرق کو غیر مبہم

طریقے سے واضح کر دیتا ہے، سورۂ برأۃ میں وارد ہوا ہے۔ سورۂ برأۃ کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ نزول کے لحاظ سے عہد نبوت کے بالکل آخری زمانے کی سورہ ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے مخالف دونوں بڑے گروہوں یعنی مشرکین عرب اور اہل کتاب کے بارے میں اس حتمی پالیسی کی وضاحت کی گئی ہے جس کی پیروی اس کے بعد مسلمانوں کے لیے ضروری تھی۔ اس پالیسی کا بنیادی ہدف، جیسا کہ آیت ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے، اس وعدۂ الٰہی کی تکمیل تھا کہ دین اسلام کو جزیرۂ عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے گا۔ گویا ان ہدایات کی نوعیت عبوری نہیں، بلکہ حتمی اور جامع پالیسی کی ہے جس میں ان حدود (Parameters) کا پوری طرح تعین کر دیا گیا ہے جن سے کسی قسم کا کوئی تجاوز کیے بغیر مسلمانوں کو ان گروہوں کے ساتھ معاملہ کرنا ہوگا۔ اس تناظر میں اب ان ہدایات کا تقابلی جائزہ لیجیے جو مذکورہ دونوں گروہوں کے بارے میں اس سورہ میں دی گئی ہیں:

مشرکین کے حوالے سے بیان کردہ پالیسی تو تین نکات پر مبنی ہے:

۱۔ نئے معاہدات پر پابندی، چنانچہ جو مشرکین اس سے قبل معاہدے توڑتے رہے ہیں، اشہر حرم گزرنے کے بعد ان کے ساتھ کیے جانے والے تمام معاہدے منسوخ ہو جائیں گے۔ جبکہ جن مشرکین نے نقض عہد کا ارتکاب نہیں کیا، ان کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے مقررہ مدت تک پورے کیے جائیں، لیکن اس کے بعد کوئی نیا معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ (آیات ۱۔ ۴)

۲۔ اسلام یا تلوار میں سے ایک کا انتخاب، یعنی اس سے قبل مشرکین کے ساتھ 'فان قاتلوکم فاقتلوھم' اور 'فان اعتدی علیکم فاعتدوا علیه' کے اصول پر معاملہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا، وہ اب منسوخ ہے، چنانچہ اشہر حرم گزرنے یا معاہدوں کی مدت مکمل ہو جانے کے بعد ان کے ساتھ صلح وسلامتی یا پرامن بقاے باہمی کا معاملہ نہیں ہوگا۔ ان کے پاس ایمان لانے اور یا پھر قتل ہو جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ (آیت ۵)

۳۔ کعبۃ اللہ کی تولیت اور اس میں عبادت کے حق کی حتمی اور فیصلہ کن تنسیخ، کیونکہ مشرکین کو مسجد حرام کی تولیت اور آبادکاری کا کوئی حق نہیں۔ یہ حق اہل ایمان کو حاصل ہے۔ (آیت ۱۷) اسی حکم کی ایک فرع یہ ہے کہ ۹ ہجری کے بعد ان کو حج کے لیے، یا ایک رائے کے مطابق مطلقاً کسی بھی حالت میں، مسجد حرام میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ (آیت ۲۸)

اس کے برخلاف اہل کتاب کے بارے میں بیان کردہ پالیسی صرف ایک نکتے تک محدود ہے، یعنی یہ کہ ان کے ساتھ قتال کر کے ان کو سیاسی لحاظ سے مطیع اور ذلت کے ساتھ جزیہ دینے پر مجبور کر دیا جائے۔ (آیت ۲۹) اس ایک نکتے پر اکتفا کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ قتال کے اس مشترک حکم کے علاوہ مشرکین کے بارے میں دی جانے والی باقی دو ہدایات یعنی معاہدات پر پابندی اور خانۂ خدا کے حق تولیت کی تنسیخ کا اطلاق اہل کتاب پر نہیں ہوتا۔

سورۂ برأۃ کی آیات سے یہ استدلال ہماری اصل تحریر میں چونکہ نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوا تھا، اس وجہ سے بعض

ناقدین اس کو سمجھنے سے قاصر رہے اور انھوں نے اس کے جواب میں یہ نکتہ پیش کر دیا کہ ایک مقام پر کسی حکم کے عدم ذکر سے حکم کی بالکلیہ نفی لازم نہیں آتی، حالانکہ یہ بات سورۂ برأۃ کے نظم پر عدم تدبر اور زبان و بیان کے اسالیب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سورہ براءۃ میں اختیار کیے جانے والے اس اسلوب کی وضاحت کر دی جائے جس پر ہمارا استدلال مبنی ہے۔

زیر بحث سورہ کے نظم کو بیک نظر سامنے لائیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مضامین واضح طور پر تین حصوں میں تقسیم ہیں:

۱۔ سورہ کے آغاز سے آیت ۲۷ تک مشرکین کی فرد جرم اور ان پر نافذ کردہ سزا کی مختلف دفعات زیر بحث آئی ہیں۔

۲۔ آیت ۲۹ سے آیت ۳۵ تک اہل کتاب کے جرائم اور ان سے متعلق پالیسی کی وضاحت کی گئی ہے۔

۳۔ چونکہ مذکورہ دونوں گروہوں کے ساتھ جہاد وقتال کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے آیت ۳۸ سے سورہ کے آخر تک مسلمانوں کو جہاد وقتال کی ترغیب نیز کمزور مدعین ایمان اور منافقین کے جہاد سے اعراض اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے زجر وتوبیخ کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔

نظم کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں، ان کے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے، الگ الگ ہدایات دینا مطلوب تھا، اس لیے اس نے ان کے احکام میں فرق کو واضح کرنے کے لیے 'تقابل' کے اسلوب میں انھیں بالترتیب دو الگ الگ اور متوازی گروہوں کے طور پر ذکر کیا ہے۔ امام رازی اس اسلوب کی معنویت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اعلم انه تعالیٰ لما ذکر حکم المشرکین فی اظهار البراءۃ عن عهدهم وفی اظهار البراءۃ عنهم فی انفسهم وفی وجوب مقاتلتهم وفی تبعیدهم عن المسجد الحرام واورد الاشکالات التی ذکروها واجاب عنها بالجوابات الصحیحة ذکر بعده حکم اهل الکتاب وهو ان یقاتلوا الی ان یعطوا الجزیة .(مفاتیح الغیب، ۲۷/۱۰) والمقصود تمییزهم من المشرکین فی الحکم لان الواجب فی المشرکین القتال او الاسلام والواجب فی اهل

''جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جب مشرکین کے بارے میں یہ احکام بیان کر دیے کہ ان کے ساتھ کیے گئے معاہدے منسوخ ہیں، ان کی جانوں کو کوئی امان حاصل نہیں، ان کے ساتھ لڑنا فرض ہے اور یہ کہ انھیں مسجد حرام سے دور کر دیا جائے، اور ان اشکالات کا ذکر کر کے جو انھوں نے وارد کیے تھے، ان کے ٹھیک ٹھیک جواب بھی دے دیے تو اس کے بعد اہل کتاب کے بارے میں یہ حکم دیا کہ ان سے لڑائی کی جائے یہاں تک کہ وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔..... اس اسلوب کا مقصد یہ ہے کہ ان کے اور مشرکین کے حکم میں فرق کو واضح کیا جائے، کیونکہ مشرکین کے بارے میں حکم یہ ہے کہ وہ اسلام لے آئیں ورنہ ان

الکتاب القتال او الاسلام او الجزیة . (۳۰/۱۰)

سے قتال کیا جائے گا، جبکہ اہل کتاب کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جزیہ ادا کر دیں (اور اپنے مذہب پر قائم رہیں)۔‘‘

مختلف افراد اور صورتوں کے احکام میں فرق کو تقابل کے اس اسلوب میں واضح کرنے کا بلاغت کے اعتبار سے ایک نمایاں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں تکرار کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ چنانچہ اگر ایک صورت میں کسی حکم کا اثبات اور دوسری صورت میں اس کی نفی مقصود ہو تو ایک جگہ اس کا ذکر کر کے دوسری جگہ سکوت اختیار کر لینا ہی وہاں اس کی نفی کی دلیل بن جاتا ہے اور صراحتاً اس کی نفی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مثال کے طور پر کوئی عدالت اگر کسی فوج داری مقدمے میں دو ملزموں کو سزا سناتے ہوئے یہ قرار دے کہ ان میں سے ایک مجرم کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے، اس کی املاک و جائیداد ضبط کر لی جائے اور اس سے دس لاکھ روپے جرمانہ وصول کیا جائے، جبکہ دوسرے مجرم کی سزا میں صرف یہ بات بیان کرے کہ اس سے پانچ لاکھ روپے جرمانہ وصول کیا جائے تو کسی عاقل کو یہ بات سمجھنے میں کوئی تردد نہیں ہوگا کہ پھانسی پر چڑھانے اور املاک و جائیداد کی ضبطی کا جو حکم پہلے مجرم کے لیے دیا گیا ہے، دوسرا مجرم اس سے مستثنیٰ ہے، اس لیے کہ تقابل کے اسلوب میں ایک کے لیے کسی سزا کا ذکر کرنا اور دوسرے کے لیے نہ کرنا اس استثنا کی قطعی دلیل ہے۔ اس اسلوب میں عدم ذکر سے مقصود ہی عدم حکم کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عدم ذکر سے عدم حکم لازم نہیں آتا تو ظاہر ہے کہ یہ صریح جہالت پر مبنی استدلال ہوگا۔

خود قرآن و حدیث میں اس اسلوب کی نہایت واضح مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کی آیت ۹۲ میں قتل خطا کی مختلف صورتوں کے احکام بیان کرتے ہوئے قرآن مجید نے فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ.

’’کسی مومن کے لیے روا نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کر دے، الاّ یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ جو شخص کسی مومن کو بلا ارادہ مار ڈالے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے عزیزوں کو دیت ادا کرے، الاّ یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ اور اگر مقتول کا تعلق کسی دشمن قوم سے ہے اور وہ خود مومن تھا تو قاتل کے ذمے صرف ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر اس کا تعلق ایسی قوم سے ہے جس کے ساتھ تمھارا عہد و پیمان ہے تو پھر اس کے عزیزوں کو دیت بھی ادا کی جائے اور ایک مسلمان غلام کو بھی آزاد کیا جائے۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں قتل خطا کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں: ایک یہ کہ مقتول دارالاسلام کا باشندہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد ہو جس کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں۔ تیسری یہ کہ اس کا تعلق کسی ایسی غیر مسلم قوم سے ہو جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے۔ پہلی اور تیسری صورت میں اللہ تعالیٰ نے کفارۂ قتل میں دو چیزیں لازم قرار دی ہیں، ایک دیت کی ادائیگی اور دوسرے ایک مومن غلام کو آزاد کرنا، جبکہ دوسری صورت میں صرف ایک چیز کا ذکر کیا ہے یعنی ایک مسلمان غلام کی آزادی۔ یہاں دیکھ لیجیے، اس صورت میں دیت کا ذکر نہ کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس صورت میں دیت کی ادائیگی لازم نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

البکر بالبکر جلد مائة و نفی سنة و الثیب بالثیب جلد مائة و الرجم . (مسلم، الحدود، ۳۱۹۹)

''کنوارا مرد کنواری عورت سے زنا کرے تو سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے، جبکہ شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو سزا سو کوڑے اور سنگسار کرنا ہے۔''

یہاں بھی دیکھ لیجیے، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانیوں کی سزا میں فرق بیان کرنا مقصود ہے، اور اس کے لیے تقابل کا یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ کنوارے زانی کی سزا میں 'تغریب عام' کا ذکر ہے، لیکن شادی شدہ کی سزا میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح شادی شدہ زانی کی سزا میں 'رجم' کا ذکر ہے جس کا کنوارے زانی کی سزا میں ذکر نہیں کیا گیا۔ دونوں جگہ عدم ذکر ہی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ تغریب عام کی سزا شادی شدہ زانی کو جبکہ رجم کی سزا غیر شادی شدہ زانی کو دینا مقصود نہیں۔

اسلوب کی اس وضاحت کے بعد اب اس کی روشنی میں سورۂ براۃ کی زیر بحث آیات کا مطالعہ کیجیے تو صاف واضح ہو گا کہ مشرکین کے بارے میں معاہدات پر پابندی، قبول اسلام تک قتال اور کعبۃ اللہ کے حق تولیت وعبادت کی تنسیخ پر مبنی تین نکاتی پالیسی بیان کرنے کے بعد اہل کتاب کے بارے میں صرف ایک حکم یعنی جزیہ کی ادائیگی تک قتال پر اکتفا کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ قتال کے اس مشترک حکم کے علاوہ معاہدات پر پابندی اور خانۂ خدا کے حق تولیت کی تنسیخ کے جو دو حکم مشرکین کے لیے بیان کیے گئے ہیں، اہل کتاب ان کے دائرۂ اطلاق سے خارج ہیں۔

سطور بالا میں ہم نے جو بحث کی ہے، اس سے یہ بات تو بالکل مبرہن ہو جاتی ہے کہ ملت ابراہیمی سے انحراف کی مماثلت کے باوجود قرآن مجید نے خانۂ خدا کی تولیت کے حوالے سے مشرکین اور یہود کے ساتھ ایک جیسا معاملہ نہیں کیا، تاہم ہمارا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خیال ہے کہ اس فرق کی نظری اور عملی حکمتوں کی وضاحت کے بغیر یہ بحث، غالباً، مکمل نہیں ہوگی۔ ذیل میں ہم ان متعلقہ نکات کی تفصیل کریں گے جن کی طرف ہم نے اصل تحریر میں محض اشارہ کر دینے پر اکتفا کیا تھا۔

ہماری رائے میں بیت الحرام سے مشرکین بنی اسماعیل کے حق تولیت کی تنسیخ کے حکم کو محیط تین پہلو ایسے ہیں جو مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے مابین قرآن مجید کے قائم کردہ مذکورہ امتیاز کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:

ایک، ملت ابراہیمی میں کعبۃ اللہ کا مقام اور حیثیت،

دوسرے، ملت ابراہیمی سے بنی اسماعیل کے انحراف کی نوعیت،

اور تیسرے، بنی اسماعیل پر اتمام حجت کی نوعیت۔

پہلے نکتے کو لیجیے:

'مسجد حرام' وہ سب سے پہلا گھر ہے جسے خداے واحد کی عبادت کے لیے اس سرزمین پر تعمیر کیا گیا[۲۴]۔ اس کی تعمیر ملت ابراہیمی کے بانی سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے خود کی[۲۵] اور اس کے اندر نماز، اعتکاف، قربانی اور حج جیسی عبادات کے تمام رسوم بھی انھوں نے اللہ کی راہنمائی میں خود متعین فرمائے[۲۶]۔ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت گاہ کو آل ابراہیم کے لیے ایک روحانی مرکز اور مرجع قرار دیا[۲۷] اور اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دور و نزدیک علاقے کے لوگوں کو سفر کر کے اس میں حاضر ہونے اور مختلف عباداتی رسوم ادا کرنے کی دعوت دی[۲۸]۔ ملت ابراہیمی کی اساس پر بننے والی دنیا کی تمام عبادت گاہوں کی اصل اور ان کے قبلہ کی حیثیت اسی مسجد کو حاصل ہے[۲۹]۔ مولانا حمید الدین فراہی کی تحقیق کے مطابق بنی اسرائیل کے عارضی قبلہ یعنی 'خیمۂ اجتماع' اور مستقل قبلہ یعنی 'مسجد اقصیٰ' دونوں کو 'مسجد حرام' کے تابع قرار دے کر ان کے نقشۂ تعمیر میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی تھی کہ ان کا رخ جنوب یعنی مکہ مکرمہ کی جانب ہو۔ خیمۂ اجتماع اور مسجد اقصیٰ کے مقدس ترین مقام یعنی 'قدس الاقداس' کا رخ بھی جنوب کی جانب تھا۔ علاوہ ازیں یہود کو یہ حکم تھا کہ ان کی بڑی قربانیوں کا رخ بھی جنوب ہی کی طرف ہونا چاہیے[۳۰]۔ خود انبیاے بنی اسرائیل کی وابستگی بھی مسجد حرام کے ساتھ باقاعدہ قائم رہی، چنانچہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

---

۲۴ آل عمران: ۹۶۔

۲۵ البقرہ: ۱۲۷۔

۲۶ البقرہ: ۱۲۵۔ الحج: ۲۶ تا ۳۸۔

۲۷ البقرہ: ۱۲۵۔

۲۸ الحج: ۲۷۔

۲۹ البقرہ: ۱۲۵، ۱۴۹۔

۳۰ رسالہ ذبیح۔

یونس علیہما السلام کے بارے میں تو مستند روایات میں یہ ذکر ہے کہ وہ بیت اللہ کے حج کے لیے حاضر ہوئے[31]، جبکہ بعض غیر مستند روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ بیت اللہ کی تعمیر کے بعد دنیا میں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جو اس کی زیارت وطواف کے لیے حاضر نہ ہوا ہو۔[32] گویا اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات روز اول سے طے شدہ تھی کہ توحید کی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلانے کے لیے مرکز کی حیثیت اسی عبادت گاہ کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ اس کی تولیت بنی اسماعیل کے سپرد کی گئی جن میں سیدنا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی دعا کے مطابق اس آخری پیغمبر کو مبعوث ہونا تھا جو ملت ابراہیمی کی دعوت توحید کو آل ابراہیم کے محدود دائرے سے نکال کر اقوام عالم تک پہنچانے کے سلسلے کا آغاز فرمائے۔[33] قرآن مجید نے بیت اللہ کی تاریخ کے یہ تمام پہلو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

اس کے برعکس مسجد اقصیٰ کی حیثیت محض بنی اسرائیل کے قومی قبلہ اور مرکز عبادت کی تھی۔[34] مسجد حرام کے بالکل برعکس، دعوت توحید کے عالمی سطح پر ابلاغ میں اس مسجد کا کوئی بنیادی کردار نہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں مقرر کیا گیا تھا، نہ اس کے بنانے والوں کے ذہن میں اس کا کوئی تصور موجود تھا اور نہ عملاً اس کو ایسا کوئی مقام تاریخ میں کبھی حاصل ہوا۔ مولانا قاری محمد طیب اس نکتے کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''حق تعالیٰ کی حکمت وقدرت کا کرشمہ تھا کہ یہ دعوت گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانۂ خیر وبرکت میں عرفی اور تبلیغی انداز سے پوری دنیا تک نہ پہنچ سکی، لیکن حکمت الٰہی نے انھیں کے ذریعہ اس دعوت کو ایک خاص تکوینی انداز سے عالمگیر بنا دینے کی صورت میں انھیں کے ہاتھوں سے قائم فرما دی اور وہ یہ کہ انھوں نے بامر خداوندی اس دنیا میں وہ مرکز رشد وہدایت قائم فرما دیا جو اس دعوت عامہ کے لیے مرکز نشر واشاعت اور مرکز توحید واتحاد بننے والا تھا۔ اور وہ کعبۂ مقدسہ تھا جس کی تعمیر کا انھیں امر دیا گیا اور اس طرح اس دعوت کے عموم کی اساس وبنیاد قائم ہوگئی۔ دوسرا مرکز آپ ہی نے فلسطین میں (ارض مقدسہ میں) قائم فرمایا یعنی مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تاکہ بنی اسرائیل ملت ابراہیمی سے ہٹنے نہ پائیں۔ اور اگر وہ اسے آگے نہ بھی بڑھا سکیں تو کم سے کم اس عبادت گاہ کی بدولت خود تو اس ملت پر جمے رہیں اس لیے مسجد اقصیٰ کی خدمت اور تولیت ان ہی کی اولاد میں بنی اسرائیل کے حصہ میں آئی جو فلسطین میں آباد ہوئے۔ مگر یہ اک حقیقت ہے کہ حضرت خلیل اللہ کو اس دعوت ابراہیمی یا ملت ابراہیمی کو عالمی انداز سے پھیلانے کی جو توقعات بیت اللہ کے راستے سے حجاز مقدس اور بنی اسماعیل سے قائم ہوئیں، وہ مسجد اقصیٰ کے راستے فلسطین میں بنی اسرائیل سے قائم نہیں ہوئیں۔ یعنی ان کے ذہن مبارک میں حقیقی مرکز ارشاد وہدایت کعبۂ مقدس تھا، مسجد اقصیٰ نہ تھی۔'' (مقامات مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام ۷۲، ۷۳)

''کعبہ واقصیٰ کو برکت وہدایت کا گھر بھی ایک ہی انداز سے بتایا گیا۔ فرق اتنا ہے کہ کعبہ کی برکت وہدایت 'ھدی للعالمین'

---

[31] مسلم، الایمان، ۲۴۲۔

[32] ازرقی، اخبار مکۃ، ۱/ ۷۲۔

[33] البقرہ: ۱۲۹۔

سے عالم گیر بتلائی گئی جس سے برکت وہدایت کی لاتحدیدی نمایاں ہے، اور اقصیٰ کی برکت وہدایت کے ساتھ 'الذی بارکنا حولہ' فرمایا گیا جس میں ہمہ گیری کا ذکر نہیں بلکہ ماحول کی قید سے مقامیت عیاں ہے۔'' (ایضاً، ۳۶۰)

دونوں عبادت گاہوں کے مقام اور حیثیت میں یہ فرق اسلامی شریعت کے عملی احکام میں بھی پوری طرح نمایاں ہے:

o مسجد حرام کو تو اسلامی شریعت میں نماز کے لیے قبلہ بھی مقرر کیا گیا ہے اور حج اور قربانی جیسی عبادات کے لیے مرکز بھی، جبکہ مسجد اقصیٰ کو ان میں سے کوئی ایک شرف بھی حاصل نہیں۔ اس ایک فرق کے سوا کہ اس میں عبادت کا ثواب عام مساجد سے ڈھائی سو گنا زیادہ ہے، اس میں اور باقی مساجد میں درجے یا احکام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔

o مسجد حرام کے اردگرد ایک مخصوص علاقے کو اسی خصوصی حیثیت کی وجہ سے شریعت میں 'حرم' کی حیثیت حاصل ہے جہاں مخصوص پابندیوں کا اہتمام لازمی ہے اور جس میں غیر مسلموں کا قیام عارضی وجوہ کے علاوہ جائز نہیں، جبکہ مسجد اقصیٰ اور اس کے اردگرد علاقے کو اس طرح کا کوئی خصوصی امتیاز حاصل نہیں۔

o مسجد حرام کے مقام ومرتبہ، اس کی خصوصی حیثیت اور اس میں عبادت کی فضیلت سے، ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ قرآن وسنت کے نصوص اور دین کے تواتر عملی سے یہ چیز کسی شک وشبہے کے بغیر ثابت ہے۔ اس کے برخلاف مسجد اقصیٰ میں عبادت کے اجر وثواب کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کے سامنے محض انفرادی طور پر کیا۔ آپ کا یہ ارشاد امت تک تواتر کے طریقے سے نہیں، بلکہ اخبار آحاد کے ذریعے سے نقل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر صحابہ بھی، جن کا ذکر ہم اصل تحریر میں باحوالہ کر چکے ہیں، اس مسجد کی کسی خصوصی فضیلت اور اہمیت سے آشنا نہیں تھے۔

o روایات کی رو سے عبادت کی نیت سے باقاعدہ سفر کر کے جانا تو ان دونوں عبادت گاہوں کی طرف مشروع ہے، لیکن اگر آدمی مسجد حرام یا مسجد نبوی میں نماز ادا کر سکتا ہو تو مسجد اقصیٰ کے سفر کی منت مان لینے کے باوجود اس کو پورا کرنا لازم نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن ایک شخص سے، جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تھی، فرمایا کہ تم یہیں مسجد حرام میں نماز پڑھ لو، تمھاری منت پوری ہو جائے گی۔[۳۵] اسی طرح ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک خاتون کو جو بیت المقدس کے سفر کے لیے تیار تھی، روک دیا اور فرمایا کہ یہیں مسجد نبوی میں نماز ادا کر لو۔[۳۶]

دونوں عبادت گاہوں کے درجے اور احکام میں پائے جانے والے ان اصولی اور فروعی فروق کو حق تولیت کے معاملے میں کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ اس پر بھی نہایت گہرے طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ مسجد حرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خاصہ اور بعثت عامہ دونوں کے مقاصد اور اہداف کے مرکز ومحور کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی بعثت

---

۳۴ البقرہ ۲: ۱۴۵۔

۳۵ ابوداؤد، الایمان والنذور، ۳۳۰۵۔

۳۶ مسلم، الحج، ۲۴۷۴۔

خاصہ بنی اسماعیل کی طرف ہوئی تھی اور آپ کا اصل مشن بنی اسماعیل میں توحید کا احیا اور شرک کی بیخ کنی تھا۔ بعثت عامہ کے لحاظ سے آپ کی ذمہ داری یہ تھی کہ ابراہیمی مرکز توحید کو اپنی اصل حیثیت میں بحال کر کے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مشن کا عالمی سطح پر احیا فرما دیں۔ چونکہ اس مرکز یعنی مسجد حرام پر مشرکین قابض تھے اور ان کے قبضے سے اس کو واگزار کرائے بغیر ان دونوں بعثتوں کے اہداف کی تکمیل کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی، اس لیے مشرکین کے حق تولیت کا ابطال اس سارے معاملے میں ایک ناگزیر اقدام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس طرح کی کوئی اہمیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے حوالے سے، مسجد اقصیٰ کو حاصل نہیں تھی، چنانچہ اس کے حق تولیت سے یہود کو محروم کرنے کا کوئی عملی محرک اور ضرورت بھی موجود نہیں تھی۔

اب دوسرے نکتے کو لیجیے:

آل ابراہیم کی دونوں شاخیں، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ملت ابراہیمی کی اصل تعلیمات و ہدایات سے منحرف ہو گئی تھیں، تاہم دونوں گروہوں کے انحراف میں ایک واضح فرق تھا۔ مشرکین بنی اسمٰعیل کا انحراف تو جیسا کہ قرآن مجید کے نصوص سے واضح ہے، یہ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کی اصل اساس یعنی توحید ہی کے صاف منکر ہو چکے تھے اور 'شرک' کو باقاعدہ اعتراف واقرار کے ساتھ بطور مذہب اختیار کر چکے تھے۔ وہ ایک 'الٰہ' کی نہیں بلکہ متعدد 'آلھہ' کی عبادت کے قائل تھے اور صرف خداے واحد کی عبادت کا تصور ان کے لیے اچنبھے کا باعث تھا:

إِنَّهُمۡ كَانُوۡا إِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ. وَيَقُوۡلُوۡنَ أَئِنَّا لَتَارِكُوۡا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجۡنُوۡنٍ. (الصافات ۳۷: ۳۵۔۳۶)

''ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو یہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں، کیا ہم ایک دیوانے شاعر کے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''

أَجَعَلَ الۡآلِهَةَ إِلٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هٰذَا لَشَيۡءٌ عُجَابٌ. (ص ۳۸: ۵)

''کیا اس (پیغمبر) نے سب خداؤں کی جگہ ایک ہی خدا کو مان لیا؟ یہ تو ایک بڑی ہی انوکھی بات ہے۔''

ان کے 'شرک' کے اسی پہلو کو قرآن مجید نے 'شاھدین علی انفسھم بالکفر' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''کفر سے مراد یہاں ان کا شرک ہی ہے۔ شرک کو کفر سے تعبیر کر کے دین کی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا بالکل اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ خدا کا ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید کے ساتھ ہو، بالخصوص اس شرک کے ساتھ تو ایمان باللہ کے جمع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے جس کا کھلم کھلا اقرار و اظہار ہو۔ مشرکین عرب کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے ہاں شرک کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ ان کے کسی قول یا عمل سے شرک ایک لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتا ہو، بلکہ شرک کو بطور دین اور عقیدہ کے انھوں نے اختیار کیا تھا۔ یہ ان کے تصور الوہیت کا ایک غیر منفک حصہ تھا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

(تدبر قرآن ۳/۵۴۹)

اس کے برخلاف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بے شمار اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہونے اور بہت سے مشرکانہ تصورات و اعمال سے آلودہ ہونے کے باوجود اصولی طور پر 'توحید' ہی کے علم بردار تھے اور اپنے مشرکانہ تصورات و اعمال کو مختلف تاویلات کے ذریعے سے 'توحید' کے منافی تصور نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے مسلمانوں اور اہل کتاب کے مابین 'توحید' کو ایک مشترک اساس کے طور پر تسلیم کیا اور اسی کی بنیاد پر انھیں اپنے مشرکانہ تصورات و اعمال کو چھوڑ دینے کی دعوت دی:

يَـاأَهْـلَ الْـكِتَـابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ. (آل عمران ۳: ۶۴)

''اے اہل کتاب، آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے مابین یکساں مسلم ہے، یعنی یہ کہ ہم نہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت کریں، نہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کچھ لوگ دوسرے لوگوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علم بردار ہونے کے مدعی بھی۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ انھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دین میں شرک کے لیے کوئی گنجایش تھی، بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے انھوں نے یہ چیز اختیار کی اور پھر متشابہات کی پیروی کرتے ہوئے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس کے حق میں الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے کی کوشش کی۔ قرآن نے ان کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مسلم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اس کا کسی کو ساجھی ٹھہرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھہرائے، پھر اس مسلم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار و رہبان اور فقیہوں صوفیوں کو 'اربابا من دون اللّٰہ' کا درجہ کیوں دے دیا؟'' (تدبر قرآن ۲/۱۱۲)

چنانچہ قرآن مجید نے دونوں گروہوں کے انحراف و گمراہی کو واضح کرتے ہوئے یہ بات تو واشگاف انداز میں بیان فرمائی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت قائم کرنے اور ان کی ملت پر عمل پیرا ہونے کے دعوے میں دونوں گروہ جھوٹے ہیں[۳۷]، لیکن انحراف کی نوعیت میں مذکورہ فرق کی بنا پر دونوں کے ساتھ عملی معاملہ میں چند واضح امتیازات بھی قائم کر دیے:

۱۔ ایک یہ کہ وہ 'مشرکین' کا لقب خاص طور پر بنی اسمٰعیل ہی کے لیے استعمال کرتا اور 'اہل کتاب' کو مشرکین کے زمرے

۳۷؎ آل عمران: ۶۷، ۶۸۔

میں شمار کرنے کے بجائے ہر جگہ اہتمام کے ساتھ ان کا ذکر 'مشرکین' سے الگ ایک مستقل گروہ کے طور پر کرتا ہے۔[38]

۲۔ مشرکین کے حوالے سے تو، ان کے عقیدۂ شرک کی نجاست کو واضح کرنے کے لیے، یہ حکم دیا گیا کہ ان کا ذبیحہ کسی حال میں جائز نہیں، چاہے وہ اللہ کا نام لے کر جانور کو ذبح کریں۔ اس کے برخلاف اہل کتاب کے ان ذبائح کو جنھیں وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں، مسلمانوں کے لیے حلال قرار دیا گیا۔[39]

۳۔ اسی بنیاد پر مشرک عورتوں سے نکاح تو مسلمانوں کے لیے حرام،[40] لیکن اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں کے ساتھ نکاح مسلمانوں کے لیے حلال قرار دیا گیا۔[41]

ان دونوں حوالوں سے اہل کتاب اور مشرکین کے مابین امتیاز کی وجہ واضح طور پر 'شرک' تھی، اسی وجہ سے فقہا یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مجوس بھی مشرکین عرب کی طرح 'شرک' کے صریحاً اور اعترافاً قائل ہیں، اس لیے ان کے ذبیحہ اور ان کے ساتھ نکاح کا حکم بھی وہی ہے جو مشرکین کا ہے۔ سرخسی اہل کتاب اور مجوس میں اس فرق کی علت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذا لان المجوس يدعون الاهين فلا يصح منهم تسمية الله على الخلوص وهو شرط حل الذبيحة واهل الكتاب يظهرون التوحيد وان كانوا يضمرون في ذلك شركا. (شرح السیر الکبیر، ۱/۱۴۶)	''اس کی وجہ یہ ہے کہ مجوسی دو خداؤں کے قائل ہیں لہٰذا وہ ذبیحہ پر خالص اللہ کا نام نہیں لے سکتے جو کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کی شرط ہے۔ اس کے برخلاف اہل کتاب اصولاً توحید کے قائل ہیں اگرچہ اس میں وہ شرک کی ملاوٹ کر دیتے ہیں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسی فرق پر یہ فقہی جزئیہ بھی مبنی ہے کہ اگر کوئی بت پرست 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کا کلمہ کہہ دے تو یہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کافی ہوگا، لیکن اگر کوئی یہودی یا عیسائی 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کہہ دے تو اس کے مسلمان ہونے کے لیے اتنا کافی نہیں ہوگا۔ فقہا نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل کتاب چونکہ قبول اسلام سے پہلے ہی توحید کے قائل ہیں، اس لیے ان کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ توحید کا اقرار کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ انھیں 'محمد رسول اللّٰہ' کا بھی اقرار کرنا ہوگا۔[42]

۳۸؎ البقرہ: ۱۰۵۔ المائدہ: ۸۲۔ البینہ: ۱۔

۳۹؎ المائدہ: ۵۔

۴۰؎ البقرہ: ۲۲۱۔

۴۱؎ المائدہ: ۵۔

۴۲؎ سرخسی، شرح السیر الکبیر، ۱/۱۵۱۔ ابو اللیث السمرقندی، فتاویٰ النوازل، ۲۰۸۔

جمہور فقہا اسی نقطۂ نظر کے قائل ہیں جو ہم نے متن میں بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اگرچہ اہل کتاب کے ہاں ایسے اعتقادات پائے جاتے ہیں جو یا تو صریحاً شرک کے زمرے میں آتے ہیں اور یا شرک کو مستلزم ہیں، لیکن چونکہ وہ اصولاً خدائے واحد ہی کی عبادت کے

اس تفصیل کے بعد اب یہ دیکھیے کہ قرآن مجید نے مسجد حرام سے مشرکین کے حق تولیت کی تنسیخ کی بنیادی علت ان کے 'شرک' کو قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کے نصوص سے یہ علت اتنے غیر مبہم طریقے سے واضح ہے کہ حکم کے پس منظر پر روشنی ڈالنے والے کم وبیش تمام مفسرین نے اس کو نمایاں کیا ہے۔

ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں:

المومنون .... اولی بالمسجد الحرام من الکفار لقوله انما یعمر مساجد اللّٰه من آمن باللّٰه والیوم الآخر فاعلمهم اللّٰه ان الکفر باللّٰه وبالمسجد الحرام وهو ان اللّٰه جعل المسجد للمومنین ولعبادتهم ایاه فیه فجعلوه لاوثانهم ومنعوا المسلمین منه فکان ذلك کفرا بالمسجد الحرام. (احکام القرآن، ۱/۴۴۰)

''اہل ایمان مسجد حرام پر کفار سے زیادہ حق رکھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کی مساجد کو آباد کرنے کا حق انھی لوگوں کو حاصل ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو بتایا ہے کہ وہ اللہ اور مسجد حرام دونوں کے ساتھ کفر کے مرتکب ہیں، کیونکہ اللہ نے تو مسجد اہل ایمان کے لیے بنائی تھی تاکہ وہ اس میں خالص اللہ کی عبادت کریں جبکہ ان مشرکین نے اس کو ایک بت کدہ بنا کر مسلمانوں کو اس میں عبادت

قائل ہیں اور اپنے ان شرک آلود اعتقادات کو 'شرک' تسلیم کرتے ہوئے اقراری طور پر مشرک نہیں ہیں، اس لیے ان کا شمار 'مشرکین' میں نہیں ہوتا۔ ابوحیان لکھتے ہیں:

والجمهور علی ان المشرك من اتخذ مع اللّٰه الها آخر وعلی ان اهل الکتاب لیسوا بمشرکین. (ابوحیان، البحر المحیط، ۵/۲۷)

''جمہور کی رائے یہ ہے کہ 'مشرک' وہ ہوتا ہے جو اللہ کے ساتھ کسی اور ہستی کو اپنا الٰہ مان لے، اور اہل کتاب (چونکہ اس کے قائل نہیں، اس لیے وہ) مشرک نہیں ہیں۔''

تاہم بعض اہل علم کے نزدیک مشرکانہ اعتقادات کے حامل ہونے کی وجہ سے اہل کتاب، بالخصوص نصاریٰ کا شمار بھی 'مشرکین' میں ہوتا ہے، البتہ سابقہ صحف سماوی پر عمل پیرا ہونے کے دعوے اور انبیاے بنی اسرائیل کے ساتھ نسبت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو رعایت دیتے ہوئے بعض عملی احکام میں ان کے اور مشرکین کے مابین امتیاز قائم کر دیا ہے۔ (رازی، مفاتیح الغیب، ۱۰/۳۳)

اس رائے پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ کے نبیوں کے ساتھ نسبت اور ان کی ملت پر عمل پیرا ہونے کے مدعی تو مشرکین بنی اسمٰعیل بھی تھے، تو اس بنا پر یہی رعایت ان کو بھی کیوں نہیں دے دی گئی؟ تاہم اگر اس نقطۂ نظر کو برسبیل تنزل، درست مان لیا جائے تو بھی زیر بحث مسئلے میں نتیجے کے لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اس لیے کہ مشرکین عرب اور اہل کتاب کے احکام میں عملی فرق اس رائے کے حاملین کے ہاں بھی مسلم ہے۔ یہ امتیاز جیسے باقی امور میں ملحوظ رکھا جاتا ہے، اسی طرح مسجد اقصیٰ کی تولیت کے معاملے میں بھی اس کو، لازماً، ملحوظ رکھا جانا چاہیے، کیونکہ باقی امور اور مسجد کی تولیت کے معاملے میں فرق کی کوئی نقلی یا عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کرنے سے روک دیا ہے اور اس طرح مسجد حرام کی حرمت کو بٹہ لگا دیا ہے۔''

بقاعی لکھتے ہیں:

(شاهدين على انفسهم) اى التى هى معدن الارجاس والاهوية (بالكفر) اى باقرارهم لانه بيت الله وهم يعبدون غير اللّٰه وقد نصبوا فيه الاصنام بغير اذنه وادعوا انها شركائوه فاذن عمارتهم تخريب لتنافى عقدهم وفعلهم.

(نظم الدرر، ۳/ ۲۸۲)

''ان کے نفوس جو کہ نجاستوں اور خواہشات کی آماج گاہ ہیں، یوں اپنے کفر کی گواہی خود دیتے ہیں کہ یہ اقرار کرنے کے بعد کہ یہ 'اللہ کا گھر' ہے، یہ اس میں غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ کی اجازت کے بغیر انھوں نے اس میں بت نصب کر رکھے ہیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے شریک ہیں۔ ان کا اس مسجد کو آباد کرنا درحقیقت اس کو ویران کرنا ہے، کیونکہ ان کا قول اور ان کا فعل باہم بالکل متضاد ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابن کثیر فرماتے ہیں:

يقول تعالىٰ: ما ينبغى للمشركين باللّٰه ان يعمروا مساجد اللّٰه التى بنيت على اسمه وحده لا شريك له ومن قرا مسجد اللّٰه فاراد به المسجد الحرام اشرف المساجد فى الارض الذى بنى من اول يوم على عبادة اللّٰه وحده لا شريك له واسسه خليل الرحمن هذا وهم شاهدون على انفسهم بالكفر .

(تفسیر القرآن العظیم، ۲/ ۳۴۰)

''اللہ کا ارشاد ہے کہ مشرکین کو یہ حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو، جو اللہ وحدہ لا شریک کے نام پر بنائی گئی ہیں، آباد کریں۔ اگر اس لفظ کو 'مساجد اللہ' کے بجائے 'مسجد اللہ' پڑھا جائے تو اس سے مراد مسجد حرام ہوگی جو کہ روے زمین کی سب سے زیادہ محترم مسجد ہے اور جس کی تعمیر روز اول سے اللہ کے خلیل نے اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کے لیے کی تھی۔ لہٰذا شرک کے قائل ہونے کی وجہ سے مشرکین اس عبادت گاہ پر کوئی حق نہیں رکھتے۔''

آلوسی لکھتے ہیں:

وما كانوا اولياء ه اى وما كانوا مستحقين ولاية المسجد الحرام مع شركهم .... ان اولياؤه اى ما اولياء

''مشرکین اپنے شرک کے ساتھ مسجد حرام کی تولیت کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ حق تو ان لوگوں کو حاصل ہے جو شرک سے بچیں اور اس مسجد میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ

المسجد الحرام الا المتقون من الشرك الذی لا یعبدون فیه غیره تعالٰی. (روح المعانی،۹/۲۰۲) کریں۔‘‘

ابوحیان الاندلسی فرماتے ہیں:

ومعنی الآیة..... ان الکافرین باللّٰه هم الظالمون ظلموا انفسهم بترك الایمان باللّٰه وبما جاء به الرسول وظلموا المسجد الحرام اذ جعله اللّٰه متعبدا له فجعلوه متعبدا لاوثانهم.(البحر المحیط،۵/۲۰)

’’آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا انکار کرنے والے ظالم ہیں۔ انھوں نے اللہ اور رسول پر ایمان نہ لا کر اپنے آپ پر بھی ظلم کیا ہے اور مسجد حرام کو، جو خالص اللہ کی عبادت کے لیے قائم ہوئی تھی، اپنے بتوں کی عبادت گاہ بنا کر اس پر بھی ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں۔‘‘

ابوالسعود لکھتے ہیں:

شاهدین علی انفسهم بالکفر ای باظهار آثار الشرك من نصب الاوثان حول البیت والعبادة لها فان ذلك شهادة صریحة علی انفسهم بالکفر.(۴/۲۵۹)

’’مشرکین اپنے کفر کے خود گواہ ہیں، کیونکہ انھوں نے بیت اللہ کے اردگرد بت نصب کر رکھے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ ان کی طرف سے اپنے کفر کی کھلی گواہی ہے۔‘‘

خود مولانا امین احسن اصلاحی نے ’ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللّٰه‘ کی تشریح میں مشرکین سے مسجد حرام کی تولیت چھینے جانے کے حکم کی اس علت کو بہت خوبی سے واضح کیا ہے:

’’مشرکین کا لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن یہاں اس عام سے مراد قریش ہیں جو بیت اللہ کی تولیت کے مدعی تھے۔ نام کے بجائے وصف سے ان کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ حکم عام ہو جائے اور اس کی علت بھی واضح ہو جائے۔ مساجد اللہ سے مراد اگرچہ مسجد حرام ہی ہے، چنانچہ آیت ۱۹ میں اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے، لیکن اس کو جمع کے لفظ سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ مسجد حرام کا معاملہ تنہا مسجد حرام ہی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ تمام مساجد الٰہی کا معاملہ ہے۔ یہی تمام مساجد کی اصل، سب کا مرکز و محور اور سب کا قبلہ ہے۔ اس کے انتظام و انصرام، اس کے مقصد اور اس کی دعوت میں کوئی فساد پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام ہدایت و سعادت اور ساری خیر و برکت کا مرکز ہی درہم برہم ہو گیا۔ فرمایا کہ مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسجد حرام کے، جو تمام مساجد الٰہی کا مرکز اور قبلہ ہے، منتظم بنے رہیں جبکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ کفر سے مراد یہاں ان کا شرک ہی ہے۔ شرک کو کفر سے تعبیر کر کے دین کی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا بالکل اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ خدا کا ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ بالخصوص اس شرک کے ساتھ تو ایمان باللہ کے جمع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے جس کا کھلم کھلا اقرار و اظہار ہو۔ مشرکین عرب کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہاں شرک کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ ان کے کسی قول یا عمل سے شرک ایک لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتا ہو، بلکہ شرک کو بطور دین اور عقیدہ کے انھوں نے اختیار کیا تھا۔ یہ ان کے تصور الوہیت کا ایک غیر منفک حصہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس کفر کے علم بردار ہوں، ان کو یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ وہ اس گھر کی تولیت پر، جو دنیا میں توحید اور خالص خدا پرستی کا سب سے پہلا گھر اور تمام مساجد الٰہی کا قبلہ ہے، قابض رہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۳۹، ۱۴۰)

شرک کی یہ علت جس کی بنا پر مسجد حرام کا حق تولیت مشرکین سے چھینا گیا، اہل کتاب، بالخصوص یہود میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ یہود من حیث القوم ایک سے زیادہ خداؤں کے قائل تو کبھی نہیں ہوئے، تاہم اپنی تاریخ کے ابتدائی اور متوسط دور میں وہ مشرکانہ اعمال و رسوم میں ملوث ہوتے رہے۔ ۵۸۶ ق م میں ہیکل سلیمانی کی تباہی اور بابل کی ۷۰ سالہ اسیری کے بعد وہ شرک کے معاملے میں نمایاں طور پر محتاط ہو گئے اور اس کے بعد نہ انھوں نے اجتماعی طور پر بت پرستی کو اختیار کیا اور نہ مسجد اقصیٰ کو کسی بھی دور میں بت پرستی اور شرک کا مرکز بننے دیا۔ چنانچہ مسجد اقصیٰ اور یہود کے معاملے کو مسجد حرام اور مشرکین کے معاملے کے کسی بھی طرح مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔[۴۳]

اب تیسرے نکتے کو دیکھیے:

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ افراد اور اقوام کے مواخذے میں جن امور کو ملحوظ رکھتا ہے، ان میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ ان کے جرم کی سنگینی اور شناعت کس درجے کی ہے اور دوسرے یہ کہ ان پر اتمام حجت کس درجے میں ہوا اور حق بات کو قبول نہ کرنے پر ان کے پاس کس نوعیت کا عذر موجود ہے۔ اس قانون کے مطابق جرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا کی سنگینی میں بھی تفاوت ہوتا ہے اور اگر اتمام حجت میں کسی پہلو سے کوئی کمی رہ جائے تو بھی مجرم کو اس کا فائدہ ضرور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار اعتقادی اور عملی ضلالتوں میں پڑ جانے کے باوجود بنی اسرائیل چونکہ اصلاً توحید کے ساتھ وابستہ

۴۳؎ 'توحید' کے معاملے میں یہود کی حساسیت کا اندازہ ایک روایت سے کیا جا سکتا ہے۔ قتیلہ بنت صیفی رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ یہود کے علما میں سے ایک عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے محمد، اگر آپ اور آپ کی قوم شرک کا ارتکاب نہ کریں تو آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا، سبحان اللہ، ہمارے اندر شرک کی کون سی بات ہے؟ اس نے کہا کہ جب آپ لوگ قسم اٹھاتے ہیں تو کعبہ کی قسم بھی اٹھا لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر غور کیا اور پھر فرمایا کہ بھئی، اس نے بات تو ٹھیک کہی ہے، اس لیے جو شخص قسم اٹھائے تو صرف رب کعبہ کی قسم اٹھائے۔ یہودی عالم نے پھر کہا کہ اے محمد، اگر آپ اور آپ کی قوم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں تو آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا، سبحان اللہ، ہم کب ایسا کرتے ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں: جو اللہ چاہے اور تم چاہو (یعنی اللہ کی مشیت اور انسان کے ارادے کو ایک ساتھ ذکر کر دیتے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر کے لیے غور کیا اور پھر فرمایا کہ اس نے یہ بات بھی ٹھیک کہی ہے، اس لیے جو آدمی (کسی معاملے میں) اللہ کی مشیت کو بیان کرے تو (اس کے ساتھ متصلاً کسی انسان کے ارادے کا ذکر نہ کرے، بلکہ دونوں کو جدا جدا ذکر کرے اور) یوں کہے کہ 'جو اللہ چاہے اور پھر جو تم چاہو'۔ (مسند احمد، ۲۵۸۴۵)

رہے، اس لیے ان کو صفحۂ ہستی سے بالکل مٹا دینے کے بجائے ان پر قیامت تک کے لیے مغلوبیت کا عذاب مسلط کیا گیا[۴۴] اور سیدنا یونس علیہ السلام کی قوم، عذاب آنے کا واضح اعلان ہو جانے کے باوجود صرف اس وجہ سے عذاب سے بچ گئی کہ اس کی طرف مبعوث کیے جانے والے پیغمبر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔[۴۵] اسی ضابطے کے مطابق، چونکہ مشرکین کا جرم سنگینی کے لحاظ سے اہل کتاب کے جرم سے شدید تر تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان دونوں گروہوں پر اتمام حجت کی نوعیت میں بھی ایک واضح فرق تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کے انجام کا فیصلہ بھی ایک دوسرے سے مختلف کیا۔ مشرکین کی طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، بعثت خاصہ تھی کیونکہ آپ کی ذات کی حد تک آپ کی ذمہ داری اصلاً یہ تھی کہ آپ بنی اسماعیل کو ملت ابراہیمی کی اصل تعلیمات پر دوبارہ قائم کر دیں، چنانچہ آپ نے اپنی جدوجہد اور مساعی کا اصل ہدف انھی کو بنایا۔ اس کے نتیجے میں جب حق کی دعوت مشرکین پر من حیث القوم آخری درجے میں واضح ہو گئی اور اس کے باوجود وہ ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سزا بھی ان پر، کسی رعایت کے بغیر، آخری درجے میں نافذ کر دی گئی۔ اس کے برعکس اہل کتاب بھی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے اور آپ نے دلائل و براہین کی بنیاد پر ان پر بھی حجت قائم کی، لیکن وہ آپ کی دعوت اور تبلیغی مساعی کا اس طرح ہدف نہیں تھے جس طرح کہ مشرکین بنی اسماعیل تھے، اس وجہ سے اس بات کا امکان موجود تھا کہ اہل کتاب کے علما و احبار اگرچہ اپنے علم کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعواے نبوت کی حقانیت کو جانتے ہوں لیکن من حیث القوم اہل کتاب پر یہ بات اس طرح سے واضح نہ ہوئی ہو کہ ان کو کوئی رعایت دیے بغیر آخری درجے میں ان پر سزا نافذ کر دی جائے۔

آلوسی اس نکتے کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

وھی توخذ عند ابی حنیفة من اھل الکتاب مطلقا و من مشرکی العجم والمجوس لا من مشرکی العرب لان کفرھم قد تغلظ لما ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نشا بین اظھرھم وارسل الیھم وھو علیہ الصلاة والسلام من انفسھم ونزل القرآن بلغتھم وذلك من اقوی البواعث علی ایمانھم فلا یقبل

''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جزیہ عرب و عجم کے اہل کتاب اور عجم کے مشرکین اور مجوس سے وصول کیا جائے گا، لیکن عرب کے مشرکین سے قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ ان کا کفر کئی وجوہ سے سنگین تر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی کے مابین زندگی کے مختلف مراحل گزارے، آپ انھی کا ایک فرد تھے اور انھی کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اور قرآن مجید بھی انھی کی زبان میں نازل ہوا۔ یہ تمام امور ان کے ایمان لانے کے نہایت

---

۴۴ جاوید احمد غامدی، 'قانون جہاد'، ماہنامہ اشراق، مئی ۲۰۰۳، ۳۸، ۳۹۔

۴۵ یونس: ۹۸۔ القلم: ۴۸۔۵۰۔

منهم الا السيف او الاسلام زيادة فی العقوبة عليهم. (روح المعانی،۱۰/۷۹)

قوی محرکات کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے (انکار کی صورت میں) ان کو سزا بھی سنگین تر ملی ہے، چنانچہ ان سے تلوار یا اسلام کے علاوہ اور کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔‘‘

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’اہل کتاب کے ساتھ جو معاملہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، وہ اس سے مختلف ہے جس کی ہدایت اوپر مشرکین کے باب میں کی گئی ہے۔ مشرکین کے باب میں تو یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ کفر سے توبہ کر کے اسلام نہ اختیار کر لیں، اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑو، لیکن ان اہل کتاب کو جزیہ کی ادائیگی پر امان دے دینے کی ہدایت ہوئی۔ اس فرق کی وجہ وہی ہے جس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست تھی، آپ انھی کے اندر سے اٹھائے گئے تھے، انھی کی زبان میں آپ پر اللہ کا کلام اترا اور انھی کو آپ نے اپنی دعوت کا مخاطب اول بنایا اور ہر پہلو سے انھی کے معروف ومنکر اور انھی کے مطالبات کے مطابق آپ نے ان پر اتمام حجت کیا۔ اس اہتمام کے بعد ان کے لیے کسی مزید مہلت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ چنانچہ مشرکین بنی اسمٰعیل ذمی نہیں بنائے جا سکتے ہیں، لیکن دوسرے غیر مسلموں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ اسلامی حکومت میں ذمی بن کر رہ سکتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۳/۱۵۰)

اس فرق کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین کا تو بطور ایک مذہبی گروہ کے مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا، لیکن اہل کتاب کو ایک مستقل مذہبی گروہ کی حیثیت سے باقی رہنے اور اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کی اجازت دی گئی۔ دونوں گروہوں کے انجام میں اس بنیادی فرق ہی کی وجہ سے مشرکین کی تمام عبادت گاہوں کو، جن میں وہ اصنام واوثان کی پوجا کیا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ایک ایک کر کے ڈھا دینے کا حکم دیا، جس کی تفصیل ہم اصل تحریر میں بیان کر چکے ہیں، جبکہ اہل کتاب کی عبادت گاہوں کو 'مساجد اللہ'[۴۶] اور ذکر الٰہی کے مراکز قرار دیتے ہوئے نہ صرف انھیں پورا پورا تحفظ فراہم کیا گیا، بلکہ اسلامی قانون جہاد کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اس بات کو قرار دیا گیا کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ اہل کتاب کی عبادت گاہوں کو بھی تباہی اور بربادی کا خطرہ درپیش ہو تو ان کے دفاع کے لیے مسلمانوں کی تلوار حرکت میں آئے گی۔[۴۷]

ہمارے نزدیک اس فرق کا بھی عبادت گاہ کے حق تولیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لیے کہ اگر ایک مذہبی گروہ کے کلی خاتمہ (Extermination) کا فیصلہ کر دیا جائے تو ان سے ان کے قبلہ کو چھین لینا اور ان کی تمام عبادت گاہوں کو ڈھا دینا اس فیصلے کا ایک منطقی تقاضا قرار پاتا ہے، لیکن کسی مذہبی گروہ کو وجود وبقا کا حق اور اس کی عبادت گاہوں کو تحفظ کی ضمانت دینے کے بعد اس سے قبلے کا حق تولیت چھین لینا ایک لاینحل داخلی تضاد کی حامل بات ہے۔ ہم نے اصل تحریر میں اس نکتے کو ان

---

۴۶ البقرہ: ۱۱۴۔

۴۷ الحج: ۴۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لفظوں میں واضح کیا ہے:

''اس تضاد کا کیا حل ہے کہ جب اسلام میں اہل کتاب کی عام عبادت گاہوں کو تحفظ دیا گیا اور ان پر اہل مذہب کی تولیت و تصرف کا حق تسلیم کیا گیا ہے تو ان کے قبلہ اور مرکز عبادت کے بارے میں یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ وہ اس پر تولیت وتصرف یا اس کے اندر عبادت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے ؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی مذہب اور اس کے قبلے کو روحانی لحاظ سے لازم وملزوم کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اور اپنے قبلے پر اہل مذہب کے حق کی نفی کا سیدھا سیدھا مطلب خود اس مذہب کے وجود و بقا اور اس کے ماننے والوں کے مذہبی وروحانی بنیاد پر اتحاد واجتماع کے حق کی نفی ہے۔ علم ومنطق کی رو سے ان دونوں باتوں میں کوئی تطبیق نہیں دی جا سکتی کہ ایک مذہب کے لیے بطور مذہب تو وجود و بقا کا حق تسلیم کیا جائے اور اہل مذہب کے روحانی و مذہبی جذبات کے احترام کی تعلیم بھی دی جائے، لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا جائے کہ اپنے قبلے میں عبادت اور اس کی تولیت کا کوئی حق ان کو حاصل نہیں ہے۔ اگر آپ ماننا چاہتے ہیں تو دونوں باتوں کو ماننا ہوگا، اور اگر نفی کرنا چاہتے ہیں تو بھی دونوں باتوں کی کرنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے مشرکین عرب سے محض کعبہ کی تولیت کا حق ہی نہیں چھینا، بلکہ اس کے ساتھ ان کے اپنے مذہب پر قائم رہنے کے اختیار کی بھی صاف طور پر نفی فرما دی اور کہا کہ ان کے لیے نجات کی راہ صرف یہ ہے کہ وہ دین حق کو قبول کر لیں۔''

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہود اور مشرکین کے مابین اور اسی طرح مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے مابین وہ مماثلت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی جس کو فرض کر کے بعض اہل علم نے ایک گروہ اور اس کے زیر تولیت عبادت گاہ کے احکام کا اطلاق دوسرے گروہ اور اس کے زیر تولیت عبادت گاہ پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسجد حرام سے مشرکین بنی اسماعیل کے حق تولیت کی تنسیخ کی بنیادی وجہ، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت گاہ کو دین ابراہیمی کی عالمی دعوت کے لیے ایک مرکز قرار دیا تھا جبکہ یہ مشرکین ملت ابراہیمی کی اساس یعنی توحید کو چھوڑ کر شرک کو بطور مذہب اختیار کر چکے تھے، چنانچہ کسی بھی مذہبی یا اخلاقی اصول کے تحت وہ اس عبادت گاہ کی تولیت کا کوئی استحقاق نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ایک مذہبی گروہ کے طور پر ان کے خاتمے کا فیصلہ کر دیا گیا تھا جس کے بعد بیت اللہ کے ساتھ ان کے تعلق و وابستگی کا سوال ہی سرے سے ختم ہو گیا تھا۔ ان وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ بھی مسجد اقصیٰ اور یہود میں ہرگز نہیں پائی جاتی، اور اشتراک علت کے بغیر دو گروہوں کے مابین اشتراک حکم ثابت کر دینے کی علمی لحاظ سے جو حیثیت ہو سکتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

امام مسلم بن حجاج

آپ کا نام مسلم بن حجاج قیشری ہے۔ ابوالحسین کنیت ہے۔ سلسلۂ نسب مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاد ہے۔ امام مسلم ۲۰۴ ہجری میں یا ایک روایت کے مطابق ۲۰۶ ہجری میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ امام صاحب کا مولد و مسکن تو بے شک عجم کا یہ شہر ہے، لیکن ان کا سلسلہ عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تحصیل علم

امام صاحب کی تعلیم کا زمانہ وہ زمانہ تھا، جس میں علم حدیث نے صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو چکے تھے۔ نیشاپور جس میں امام صاحب کی ولادت ہوئی تھی، محدثین کا پایۂ تخت تھا۔ چنانچہ امام صاحب کو اوائل عمر ہی میں حدیث کے مقدس فن کی طرف توجہ دینے کا موقع ملا۔ انھوں نے بارہ برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی، لیکن کس کے سامنے آپ نے سب سے پہلے زانوے تلمذ تہ کیا، اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

شیوخ واساتذہ

امام مسلم کے نمایاں اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں:

اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ، حرملہ بن یحییٰ، امام احمد بن حنبل، عمرو بن سواد، سعید بن منصور، ابومصعب، امام ذہلی، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی۔

امام صاحب نے اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذہ فن سے نیشاپور میں استفادہ کیا۔ دوسرے آئمہ حدیث سے استفادہ کرنے کے لیے آپ عراق، حجاز، شام اور مصر کے علاقوں میں سفر کر کے گئے۔ بغداد میں علم ہی کی غرض سے متعدد بار

آپ کا جانا ہوا۔ وہاں کے محدثین میں سے محمد بن مہران اور ابوغسان سے آپ نے سماعت کی۔ عراق ہی کے سفر میں امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن مسلمہ قعنبی سے استفادہ کیا۔ حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے روایتیں حاصل کیں۔ مصر میں عمرو بن سواد، حرملہ بن یحییٰ سے کسب فیض کیا۔ آپ نے احمد بن مسلمہ کی رفاقت میں بصرہ و بلخ کا سفر بھی کیا۔

تلامذہ

امام مسلم سے کسب فیض کرنے والوں میں چند نمایاں نام یہ ہیں:

امام ترمذی، ابوحاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق، محمد بن عبدالوہاب فراء، علی بن حسین، حسین بن محمد بن زیاد۔

تصنیف و تالیف

امام صاحب کو تصنیف و تالیف کا فطری شوق تھا۔ آپ کی سب سے اہم تالیف صحیح مسلم ہے۔ اس کتاب کو جس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ آپ نے لکھا ہے، وہ اپنی جگہ پر انتہائی قابل داد ہے۔ آپ نے اس کے علاوہ اور بھی کتابیں لکھی ہیں مثلاً: مسند کبیر، الاسماء والکنی، جامع کبیر، کتاب العلل، کتاب الوحدان۔

ان کے علاوہ ۱۴ مزید اہم کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

علما کی شہادت

امام صاحب کی طباعی اور ذہانت نے خود ان کے اساتذہ کو اس قدر گرویدہ بنا لیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن ان الفاظ میں ان کے فضل و کمال کی نسبت پیش گوئی کرتے تھے:

''خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہوگا۔''

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے ادا شناس ان کو معرفت حدیث میں اپنے زمانے کے سب مشائخ پر ترجیح دیتے تھے۔ اسحاق کوسج خود امام مسلم سے خطاب کر کے فرماتے تھے:

''جب تک خدا آپ کو مسلمانوں کے لیے زندہ رکھے گا، بھلائی ہمارے ہاتھ سے جانے نہ پائے گی۔''

ابوقریش ان کو دنیا بھر کے چار بڑے حفاظ میں شمار کرتے تھے۔

وفات

امام مسلم کی وفات کا واقعہ علم حدیث سے آپ کے غیر معمولی تعلق کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ مجلس درس میں آپ سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ کو وہ حدیث یاد نہ تھی، جب آپ گھر واپس آئے اور

آپ نے وہ حدیث تلاش کرنے کا ارادہ کیا تو اسی وقت آپ کو کھجوروں کی ایک تھیلی پیش کی گئی۔ آپ حدیث تلاش کرتے ہوئے بڑے انہماک کی حالت میں تھیلی سے کھجوریں نکال نکال کر کھانے لگ گئے۔ حدیث کی جستجو میں آپ اس قدر محو تھے کہ آپ کو یہ خیال نہ ہوا کہ آپ اس مقدار سے بہت زیادہ کھجوریں کھا چکے ہیں جو ہضم ہو سکتی ہے۔ بالآخر وہ حدیث مل گئی، لیکن اس دوران میں بے خیالی میں آپ حد سے زیادہ کھجوریں کھا چکے تھے، چنانچہ یہ کھجوریں آپ کی رحلت کا سبب بن گئیں۔

مناقب

امام صاحب نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند آدمی تھے۔ پوری زندگی میں نہ کسی کی غیبت کی اور نہ کسی کو مارا پیٹا یا گالی دی۔ وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا بے حد احترام فرماتے تھے۔ نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی خدمت میں بکثرت حاضر ہوتے تھے، امام مسلم، امام بخاری کے تبحر علمی اور ان کے زہد و تقویٰ سے بہت متاثر تھے۔ امام مسلم کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ اپنے ہم عصر امام کی عظمت کو دل و جان سے قبول کیا۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خیال و خامہ

جاوید

○

یہ نغمہ دردِ فرقت ہے نوائے غم ہوا آخر
یہی فرقت کا رشتہ ، رشتۂ محکم ہوا آخر

مہ و انجم سے روشن تھا کبھی اپنا یہ میخانہ
وہ اس کا غلغلہ اب گریۂ پیہم ہوا آخر

یہی آدم ہوا ہے باعث تخلیق آدم بھی
یہ افسانہ بھی جزو قصۂ آدم ہوا آخر

سنا ہے اب کہیں ابلیس بھی صدیوں کی محنت سے
فرنگی بت گروں کے راز کا محرم ہوا آخر

صدا آئی یہ دین حق جب اترا آسمانوں سے
جہاں میں اختلاطِ شعلہ و شبنم ہوا آخر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہی گھر تھے جہاں کچھ روحِ مشرق دیکھ لیتے تھے

یہ شیرازہ بھی اس تہذیب میں برہم ہوا آخر

اسی دل سے فروزاں تھے زمین و آسماں لیکن

وہ ظلمت ہے کہ اس کا نور بھی مدھم ہوا آخر

ترے حرفِ عنایت سے میں بے گانہ رہا برسوں

مرے زخمِ جگر پر اب وہی مرہم ہوا آخر

تعجب ہے زمیں کو، آسماں بھی محوِ حیرت ہے

وہ اک اُمی تھا، لیکن سرورِ عالم ہوا آخر

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com